# ماروی اور مرجینا

نجم الحسن رضوی

# ماروی

اور

# مرجینا

(ناول)

نجم الحسن رضوی

اکادمی بازیافت

# انسان کے نام

مت سہل ہمیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں
(میرؔ)

# ترتیب



# تمہید

"سب آدمی اچھے نہیں ہوتے جیسے سارے پرند ہنس نہیں ہوتے، بہار کی خوش بو تو کسی کسی کے وجود سے آتی ہے۔" یہ نکتہ شاہ عبداللطیف بھٹائی نے سمجھایا تھا۔ میں نے بہار کی خوش بو کی جستجو میں اپنے طریقے سے انسانوں میں ہنسوں کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔

یہ میرا پہلا ناول ہے، اگرچہ اس سے پہلے میرے افسانوں کے چھ مجموعے شائع ہو چکے ہیں، گویا فکشن سے میری محبت اور وابستگی پرانی ہے۔

اس ناول کے دو باب ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر وزیر آغا کے رسالے "اوراق" میں ایک طویل افسانے کی شکل میں 'ماروی کی واپسی' کے نام سے چھپے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ سندھ میں زبان کے نام پر خلفشار مچا تھا اور آس پاس ہنسوں کو تو چھوڑیے خود آدمیوں کو پہچاننا مشکل ہو گیا تھا۔ اس ناول نے اس وقت میرے ذہن میں جنم لیا مگر اسے مکمل کرنے کا کام میں نے کسی مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا۔ اور سندھو سائیں بہتا رہا اور میرے زمین و آسمان بھی بدلتے گئے، میں جس کے نتیجے میں کراچی سے پہلے کوئٹہ اور اسلام آباد اور پھر دُبئی جا پہنچا اور نئے خیالات اور مشاہدات کی یلغار سے ناول کا خاکہ کسی فیلِ بے ہنگم کی صورت پھیلتا چلا گیا جسے سمیٹنے کے لیے خاصی کاری گری کی ضرورت تھی اور خاصی فرصت کی بھی۔ خیر، جب میں خطۂ عرب میں تیس سال گزار کے وطن واپس لوٹا تو دل نے پھر خواہش کے بند دروازے پر دستک دی اور ادھر عزیز دوست مبین مرزا کی آنکس زنی نے مجھے اس فیلِ بے زنجیر پر قابو پانے کا حوصلہ دیا۔ پھر جو میں یہ ناول لکھنے بیٹھا تو پتا چلا کہ جس کام کو میں بہت مشکل سمجھ رہا

تھا، وہ اتنا مشکل بھی نہیں تھا اور خود مجھے اس بات پر بڑی حیرت ہوئی کہ صرف دو مہینے میں یہ کام مکمل ہوگیا، گویا:

صرف مانع تھی حیا، بندِ قبا کھلنے تک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

تو یہ "جانِ حیا" اب آپ کی نذر — میں کہانی کے متن کے بارے میں کچھ زیادہ کہنا نہیں چاہتا، سوائے اس کے کہ ناول کی عمارت جن دو ستونوں پر قائم ہے، وہ ماروی اور مرجینا کے کردار ہیں۔ اگر وفا سرشت ماروی سندھ کی ایک مشہور لوک کہانی کا لافانی کردار ہے تو مرجینا کو عرب فکشن کے شاہ کار 'الف لیلۂ' کا ایک زندہ ورق سمجھیے۔

اگرچہ کہانی کا مرکزی نکتہ انسان ہی ہے جو سرشت کے اعتبار سے 'ازلی قانون شکن' اور 'ملکیت پسند' ہے اور ہر شے کو اپنے قبضۂ قدرت میں لانا چاہتا ہے مگر ان دونوں کرداروں نے کہانی کو دو مختلف تہذیبی منطقوں میں آگے بڑھنے کے انوکھے امکانات فراہم کیے ہیں۔

مجھے یہ دونوں کردار ہمیشہ سے بہت پسند ہیں اور ان کے 'مزاحمتی' مزاج کی بنا پر مجھے دونوں میں بڑی مماثلتیں نظر آتی ہیں۔ میں نے کوشش کی ہے کہ نئی جون میں آ کے یہ دونوں کردار جیتے جاگتے انسانوں کی طرح سانس لیتے نظر آئیں۔

ناول کے منفرد تہذیبی منظر ناموں کی تشکیل میں ایسے تلازمے، علامتیں، استعارے اور اساطیری اور داستانی حوالے استعمال ہوئے ہیں جو ایک طرف تو برصغیر کی تہذیبی فضا اور دوسری طرف عرب دنیا کے کلاسیکی فکشن اور سماجی اور ثقافتی ورثے کی ترجمانی کرتے ہیں۔

مجھے یہ ناول لکھتے ہوئے بڑا لطف آیا مگر مجھے اصل خوشی اس وقت ملے گی کہ اس ناول کو اپنا قاری نہ ڈھونڈنا پڑے بلکہ خود قاری اس کی تلاش میں رہے۔

نجم الحسن رضوی
کراچی، ۱۵ر ستمبر ۲۰۱۱ء

# ۱

# سفینۂ نجات

نیلا سمندر چھلانگیں لگاتا اس کے نتھنوں میں داخل ہوا اور پورے دو دن اس کے لٹے ہوئے بدن پر قبضہ جمائے رہا۔ وہ جب بھی اٹھنے کی کوشش کرتا، سمندر کی سیلی ہوئی بساندی ہوا اس کی مشکیں کس دیتی اور سر میں درد کے بھنور جاگ اٹھتے۔ نیم بے ہوشی کے عالم میں وہ خود کو ایسی سیپ میں بند ہچکولے کھاتا دیکھتا رہا جس پر سمندر اور آسمان کی کائی جمی ہوئی تھی۔

تیسرے دن ناصر نے چکر اور متلی سے نجات پا کے ذرا آنکھ کھولی تو کشتی کے ناخدا کو اپنی طرف تکتے پایا۔ اس کے چہرے پر داڑھی اتنی گھنی تھی کہ نقلی لگ رہی تھی اور آنکھیں چمک دار تھیں، آواز بلغم زدہ تھی اور لہجے میں کرختگی۔ "یہ تمھارا پہلا سمندری سفر ہے نا؟" وہ بولا۔ "خیر، اب خیریت رہے گی، سمندر اب تک ذرا ناراض تھا۔"

ناخدا لکڑی کے فرش پر بھاری قدم رکھتا اپنے کیبن کی طرف چلا گیا۔ وہ اٹھ کے بیٹھ گیا۔ لانچ کے سامنے والے حصے میں کئی لوگ مختلف قسم کے کاموں میں مصروف تھے۔ ایک آدمی بوریوں پر پڑی ترپال ٹھیک کر رہا تھا۔ کچھ ملاح بھیگے ہوئے رستے لپیٹ رہے تھے۔ دھوپ میں تیزی نہیں تھی۔ پہلی بار اسے ہوا اچھی لگی۔ اس نے قمیص کے بٹن کھول دیے اور

گہرا سانس لے کر سامنے دیکھا۔ لانچ کی قینچی تیزی سے سمندر کی نیلی چادر قطع کرتی جا رہی تھی۔ وہ اپنے گھر سے پتا نہیں کتنی دور آ چکا تھا اور ابھی منزل نجانے کتنی دور تھی۔ اداسی کی ایک شدید لہر اس کے اندر سے اٹھی اور اس کے سارے وجود کو بھگو گئی۔ اس کے دل میں جانے پہچانے دُکھوں کی ڈولیاں اترنے لگیں۔ گھر کی دہلیز سے باہر بعض وقت ایک قدم کتنا طویل ہوتا ہے اور کیسا جان لیوا۔ اس نے سوچا۔ اسی وقت لکڑی کے زینوں پر ایک سیاہ فام آدمی نمودار ہوا۔ اس نے پکار کے کہا، ''کھانا تیار ہے۔'' عرشے پر کام کرتے لوگ نیچے جانے لگے۔

ایک آدمی ناصر کے پاس آیا، ''اپنا کھانا لے آؤ، تم تو کئی وقت سے بغیر کھائے پیے...''

وہ اٹھا۔ ایک طرف پانی کی ٹنکی رکھی تھی۔ اس نے وہیں کھڑے کھڑے ہاتھ منہ دھویا اور پھر ملاحوں کے پیچھے پیچھے چل دیا۔

وہ ہاتھ میں روٹی اور دال گوشت کی پلیٹ لیے ریلنگ کے پاس کھڑا تھا کہ بلغم زدہ آواز نے اس کی سمت میں جست لگائی، ''تمھیں اپنی دوبارہ پیدائش مبارک ہو!'' ناخدا مسکرایا۔

''میں سمجھا نہیں۔'' وہ بولا۔

ناخدا نے کہا، ''ارے بھئی تم نے تیسرے دن آنکھیں کھولی ہیں، سمندری سفر میں یہ تمھاری زندگی کا پہلا دن ہے، اس طرح— گویا نیا جنم!'' ناخدا نے اپنی میلی واسکٹ سے موٹا سا چرٹ نکال کے سلگایا۔

نیا جنم— اس نے سوچا، مگر ابھی تو اس کے بدن پر پچھلے جنم کی ساری گرد جمی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں وہ سارے منظر، وہ سارے چہرے، وہ سارے رنگ چھلک اٹھے جنھیں وہ پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

''اس رات تم بالکل ٹھیک وقت پر آئے، ہم لوگ بس روانہ ہی ہونے والے تھے!'' ناخدا نے کہا، ''تمھارا وہ دوست جو تمھیں سوار کرانے آیا تھا، ہمارا بہت پرانا ساتھی ہے، جب ہی تو ہم نے تمھیں اپنے ساتھ لے چلنے کی ہامی بھر لی، ورنہ تم جانتے ہو، یہ کتنے خطرے کا کام ہے۔'' ناصر چپ چاپ دال گوشت کھاتا رہا۔ ناخدا نے چرٹ کا گہرا کش لیا اور سمندر



کی طرف دیکھ کے بولا، ''بس دو دن اور— پھر ہم اپنی منزل پر جا پہنچیں گے۔''

''اب کوئی خطرہ تو نہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''خطرہ؟'' ناخدا نے بھنویں اوپر اٹھائیں، ''جب ایک بار گھر سے باہر نکل آئے تو پھر اس بات سے ڈرنا— خطرہ، ڈر، خوف اپنے اندر ہوتا ہے، اپنے اندر مت جھانکو۔''

اور وہ اب یہی کر رہا تھا۔ اندر کھلنے والے سب دروازے اس نے بند کر دیے تھے۔ اس رات مچھیرے کے روپ میں فرار ہوتے ہوئے اسے یقین نہیں تھا کہ وہ ان کے چنگل سے بچ سکے گا، مگر اب وسوسے پیچھے رہ گئے تھے۔

ناخدا نے پوچھا، ''آخر وہ تمھارے پیچھے کیوں ہیں، کیا تم نے کسی کو قتل کیا ہے؟''

''نہیں!''

''کوئی زمین ہتھیائی ہے؟''

''نہیں۔''

اس وقت سیاہ فام آدمی ان کے قریب آیا اور ناخدا سے بولا، ''بادل آ رہے ہیں، بوریوں کو عرشے پر سے ہٹانا پڑے گا ایسا نہ ہو کہ بارش...''

ناصر نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ناخدا کے سوالوں سے جان بچ گئی ورنہ اس کا اگلا سوال یہی ہوتا کہ کیا تم نے کوئی عورت... اور جواب دینا مشکل ہو جاتا۔

ناخدا اب بوریوں کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ اس نے کہا، ''سامنے والی بوریاں نیچے رکھوا دو اور باقیوں پر ترپالیں اڑھا دو۔'' سیاہ فام آدمی چلا گیا تو ناصر نے پوچھا، ''ان بوریوں میں کیا ہے؟''

''ان بوریوں میں—'' ناخدا بولا، ''ان میں آلو ہیں۔''

''آلو—؟''

''ہاں، ہم اپنی کشتی پر آلو لے جاتے ہیں۔''

ناصر نے کہا، ''مگر میں نے تو سنا تھا کہ...''

''کیا سنا تھا؟'' ناخدا کی آنکھوں کی مشعلیں اچانک بھڑک اٹھیں۔

وہ ڈر گیا، بولا، ''کچھ نہیں۔''

ناخدا نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا، ''میں دوسروں کی بات نہیں کرتا مگر تم جانتے ہو میں بس مصیبت زدوں کی مدد کرتا ہوں جیسے اس بار—'' ناخدا نے چرٹ کا گاڑھا دھواں فضا میں بکھیرا اور اسے دیکھ کے مسکرایا۔ اچانک بادل گھرے ہوگئے اور بارش ہونے لگی۔ سمندر کا رنگ بدل گیا اور ملاح دوڑ دوڑ کے ترپالیں ٹھیک کرنے لگے۔ بارش کی ایک تیز بوچھاڑ آئی تو ناخدا عرشے پر تنے ترپال کے سائبان کے نیچے چلا گیا۔ ناصر اپنی جگہ کھڑا رہا۔ بارش تیز ہوگئی۔ وہ دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے بھیگتا رہا۔

''تم بھاگے کیوں؟'' ناخدا پھر اس سے مخاطب تھا۔ ناصر بھی ترپال کے نیچے چلا گیا اور پھر قمیص اتار کے نچوڑتے ہوئے بولا، ''وہ لوگ مجھے پکڑنا چاہتے تھے، وہ مجھے مار دیتے۔''

''مگر کیوں؟''

''جو میں نے کیا تھا، وہ انھیں پسند نہیں تھا۔'' اس نے چادر سے گیلا بدن پونچھا اور قریب رکھے صندوق پر بیٹھتے ہوئے بولا، ''میرا سب کچھ پیچھے رہ گیا ہے، شاید میں نے فرار ہو کے اچھا نہیں کیا۔''

ناخدا نے کہا، ''خیر اب تم اپنے دماغ سے ساری فکریں نکال دو، آدمی موت سے ڈرتا ہے مگر زندہ رہنا بھی کوئی آسان نہیں ہے، اب تمھیں اس کی فکر کرنی ہے۔'' وہ ٹہلتا ہوا دوسری طرف چلا گیا۔

بارش ذرا دیر میں تھم گئی لیکن اندھیرا بڑھتا گیا اور سمندر کا شور بھی۔ تمام رات وہ ڈولتے تختوں پر لیٹا ہانپتی کانپتی کشتی کو سمندر کی دیوپیکر موجوں سے ہاتھا پائی کرتے دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی کوئی طاقت ور اور خودسر لہر لانچ کو اوپر اچھالتی تو سارے تختے ہل جاتے جن پر بہت سارے لوگ لیٹے ہوئے تھے۔ ایک بار سمندر کی سطح پھٹی اور اس میں سے ایک ہرا بھرا کھیت ابھر آیا۔ کھیت سمندر میں تیرتا ہوا کشتی کے ساتھ آ لگا۔ گندم کی بالیاں ہوا میں جھوم رہی تھیں، اس نے غور سے دیکھا تو پتا چلا کہ وہ لوگوں کے ہلتے ہوئے ہاتھ تھے۔ وہ سب اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ وہ چپکے سے ان ہاتھوں کے درمیان اتر گیا جو اسے گلے لگانے کو



بے تاب تھے۔ اچانک اسے نوری نظر آئی، وہ اس کے قریب آ کے بولی، ''اپنی فصل کا خیال رکھنا!'' اچانک سیٹیاں بجنے لگیں، گاڑیاں روشنیاں چمکاتی دوڑی چلی آ رہی تھیں۔ پھر کسی نے اس پر چھلانگ لگائی۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اس نے دیکھا وہ کشتی میں تھا اور سیاہ فام آدمی اس کی ٹانگوں سے الجھ کے اس پر گر پڑا تھا۔ قریب سے ایک دوسری لانچ گزری اور اس نے بھی روشنیاں چمکائیں۔ سیاہ فام آدمی تیزی سے اٹھا اور اوپر ناخدا کے کیبن کی طرف چلا گیا۔ چند لمحوں بعد وہ ناخدا کے ساتھ واپس آیا۔ ناخدا نے کہا، ''ابھی گزرتی ہوئی لانچ نے خبردار کیا ہے کہ آگے چیکنگ ہے۔ کچھ وقت تمھیں مال خانے میں گزارنا ہوگا جیسے ہی خطرہ ٹلے گا، ہم تمھیں اوپر بلا لیں گے۔''

سیاہ فام آدمی نے اس کی رہنمائی کی۔ چھوٹے سے پتلے زینے کے نیچے تاریکی تھی۔ اس نے دیکھا یہ سامان رکھنے کا تہ خانہ تھا جہاں ہر طرف بوریوں کی دیواریں چنی ہوئی تھیں۔ ایک دیوار کے پیچھے ایک دیوار پھر ایک اور دیوار۔ سب سے پچھلی قطار میں پہنچ کے سیاہ فام آدمی نے سب سے نیچے رکھی ہوئی بوری ہٹائی اور ٹارچ کی روشنی میں ایک سرنگ کا دہانہ دکھا کے بولا، ''آپ اس کے اندر چلے جاؤ، بہت محفوظ جگہ ہے۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور تاریکی میں سرنگ کے اندر رینگ گیا۔ جیسے ہی اس کی ٹانگیں اندر ہوئیں، سرنگ کا منہ بند ہوگیا۔ اس نے اندھیرے میں ہاتھ آگے بڑھایا، اس کے سرہانے اور دائیں بائیں بوریاں تھیں۔ نیچے لانچ کے نم آلودہ تختے تھے اور اوپر— اس نے ہاتھ پھیرا، اوپر بھی تختے تھے۔ گویا وہ ایک لمبی سی بینچ کے نیچے لیٹا تھا جس کے اوپر بوریاں سجی ہوئی تھیں۔ لانچ ہچکولے کھاتی آگے بھاگتی جا رہی تھی۔ وہ ایک کروٹ لیٹے لیٹے تھک گیا تو دوسری کروٹ بدل لی مگر جگہ بہت تنگ تھی، کروٹ بدلتے ہوئے بوریوں کی رگڑ سے اس کا بدن چھل گیا۔ اسے لگا جیسے وہ مر چکا ہے اور اپنی قبر میں لیٹا ہے۔ تختوں کی چھت، تنگ دیواریں اور اندھیرا— تو میں مر چکا ہوں۔ اس نے سوچا، اور مجھے دفنا دیا گیا ہے مگر کیسی عجیب بات ہے کہ بجائے اس کے کہ لوگ مجھے اپنے محبت بھرے ہاتھوں سے رخصت کرتے، میں خود دوڑ کے اپنی قبر میں گھس گیا ہوں۔ یہ قبر ہے کہ چوہے کا بل ہے— اسے دم گھٹتا ہوا سا محسوس ہوا، اس کے مساموں سے

دھواں سا نکلنے لگا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کے سرھانے کی بوری کھسکانی چاہی، بوری کھسکی تو نہیں مگر ذراسی ترچھی ہوگئی اور ساتھ ہی کسی کے سسکنے کی آواز اس کے کان میں پڑی۔

"کون ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"چپ رہو—" بوری کے پیچھے کوئی کراہا۔ جانتے نہیں ہم اپنی اپنی قبروں میں لیٹے ہیں، مردے باتیں نہیں کرتے۔"

"مگر تم ہو کون؟"

"جو تم ہو، وہ میں ہوں!" بوری کے پیچھے سے آواز آئی، "زیادہ سوال مت کرو، میں تمھارے سوالوں کا جواب نہیں دے سکتا، مجھے سانس کی تکلیف ہے، بس چپ چاپ لیٹے رہو، جیسے اور لوگ لیٹے ہیں۔"

"تو کیا اور لوگ بھی؟" اس نے حیران ہو کے پوچھا لیکن اس بار کوئی جواب نہیں آیا۔ بوری کے پیچھے بوجھل سانسوں کا سلسلہ جاری رہا۔ فضا میں گھٹن تھی اور بوریوں سے اٹھتے ناگوار بو کے بھبکے۔ لانچ اندھیرے کی دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتی رہی اور پھر کسی وقت سرنگ کا منہ کھلا اور کسی نے پکار کے کہا، "باہر آجاؤ، خطرہ ٹل گیا ہے۔" ناصر رینگتا ہوا باہر آگیا۔ رات اپنے آخری دموں پر تھی اور صبح ہونے والی تھی۔ ناخدا سامنے کھڑا تھا۔ ذرا دیر میں ناصر کو کچھ اور لوگ بھی عرشے پر نظر آئے، سوتے جاگتے ہوئے۔ وہ انھیں دیکھتا رہا، شاید ان میں وہ بھی تھا، سرنگ کے اندر کا دوسرا آدمی۔ تھوڑی دیر بعد ناخدا ناصر کے پاس آیا۔ "ٹھیک تو ہو نا؟" وہ بولا، "نیچے تکلیف تو بہت ہے مگر بس ایک رات اور پھر ہم منزل پر جا پہنچیں گے۔ شام ہوتے ہی سرنگ کی سیاہ دیواروں نے اسے پھر سے نگل لیا۔ اندر حسبِ توقع بہت گھٹن تھی اور بوریوں کی ناگوار بو سے جی متلا رہا تھا۔

پتا نہیں کتنے پہر گزرے، پھر اچانک سرنگ کا منہ کھلا اور کسی نے کہا، "باہر آؤ، اوپر چلو، تمھیں ناخدا بلا رہا ہے۔" ناخدا نے کہا، "ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوسٹ گارڈ گشت پر ہے، ہمیں اب کچھ اور انتظام کرنا ہوگا۔" چند لمحوں کے بعد ناصر سب سے اوپری منزل پر رسیوں سے لٹکتی لائف بوٹ میں ترپال کے نیچے دم سادھے لیٹا تھا۔ اچانک اسے پانی میں



پھر پھینکے جانے کی آواز آئی۔ اس نے نیچے جھانک کے دیکھا، ملاح کچھ چیزیں سمندر میں پھینک رہے تھے۔ وہ چند بوریاں تھیں جن کے منہ بندھے ہوئے تھے۔ ذرا دیر گزری تھی کہ کوسٹ گارڈ کی دو کشتیاں لانچ کے قریب آئیں۔

"ٹھہرو! کدھر جا رہے ہو؟" ایک موٹر بوٹ سے لاؤڈ اسپیکر پر پوچھا گیا، "اور کیا لے جا رہے ہو؟"

ناخدا نے چیخ کے جواب دیا، "صرف کارگو جناب— آلو کی بوریاں۔"

کوسٹ گارڈ نے سرچ لائٹ کے ذریعے لانچ پر لدی ہوئی بوریوں کا جائزہ لیا۔ وہ اوپر لائف بوٹ میں دم سادھے لیٹا رہا۔ کوسٹ گارڈ مطمئن ہو کے آگے بڑھ گئے تو وہ نیچے اترا۔ "اس لائف بوٹ نے مجھے بچا لیا۔" اس نے کہا۔ ناخدا اسے دیکھ کے مسکرایا، "اب وہ واپس نہیں آئیں گے۔ ویسے بھی کنارا نزدیک ہے، بس آدھے گھنٹے کا سفر اور۔" ناصر نے کہا، "میری وجہ سے تم لوگوں کو بہت پریشانی اٹھانا پڑی۔"

ناخدا ہنسا، "تم میرے بہت عزیز دوست کے دوست ہو، ورنہ ایسے موقعوں پر ہم پریشانی اپنے ساتھ نہیں رکھتے۔"

اس نے پوچھا، "اور وہ بوریاں؟"

"کون سی بوریاں؟" ناخدا پھر ہنسا، "اچھا وہ، بھئی بہت سے آلو خراب ہو گئے تھے، تم جانتے ہو، کتنی شدید گرمی ہے۔"

"مگر—" ناصر نے ڈرتے ڈرتے کہا، "مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے وہاں کچھ آدمی بھی دیکھے تھے۔ ناخدا نے اسے گہری نظروں سے دیکھا اور سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا، "ہمیشہ یاد رکھو کہ ہر بات یاد رکھنے کے قابل نہیں ہوتی۔" وہ کچھ لمحے خاموش رہا، پھر سپاٹ لہجے میں بولا، "جب خطرہ سر پر منڈلا رہا ہو تو میرے لیے آدمی اور آلو میں تمیز کرنا مشکل ہوتا ہے، اپنے بھی اپنی مٹی کے باہر دونوں برابر ہیں۔"



# ۲

# سنہرا ساحل

عمران نے بتایا تھا کہ اگر تم ایک بار سنہرے ساحل تک پہنچ گئے تو پھر سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ کشتی سے اترتے ہی تمھارے میزبان تمھیں اپنی نگرانی میں لے لیں گے، سند باد نے یہی کہا ہے۔

''سند باد کون؟'' ناصر نے پوچھا۔

''کشتی کا ناخدا اور کون — میں اسے جانتا ہوں، ماہر جہازی ہے اور بحری مخلوقات اور سمندری عجائبات کا دل دادہ۔ اسے کشتیوں اور جہازوں سے عشق ہے۔'' عمران نے جواب دیا۔

لانچ اندھیرے ساحل کے اس حصے میں لنگر انداز ہوئی جہاں پہاڑیوں کا ایک قافلہ دور تک پھیلا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ناخدا نے کہا، ''میں نے پیغام بجھوا دیا تھا، تمھارے میزبان پہاڑی کے پار سڑک پر ملیں گے، لہٰذا اب کشتی سے اترو اور ناک کی سیدھ میں چلے جاؤ!''

ناصر نے اپنا چھوٹا سا کالا تھیلا اٹھایا جس میں کپڑوں کے چند جوڑے تھے اور ناخدا سے ہاتھ ملا کے ڈگمگ ڈولتی لانچ سے نیچے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ کشتی اور ساحل کے درمیان سمندر کی تڑپتی موجوں پر لکڑی کے ایک ناہموار تختے نے پل سا بنا دیا تھا جسے احتیاط





سے پار کرنا تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا کنارے پر اترا تو سامنے کالی چٹانوں پر جو کوئلے کی بنی ہوئی لگ رہی تھیں، سمندری لہریں سر پٹختی نظر آئیں۔ وہ خاموشی سے پانی میں ڈوبے پتھروں پر قدم رکھتا اوپر چڑھتا گیا۔ کالی چٹانوں پر چڑھتے ہوئے اسے ذرا سا خوف محسوس ہوا کہ اس کی ذرا سی بے احتیاطی اسے اندھیرے پانیوں میں گرا سکتی تھی مگر ہوش حواس اس کے ساتھ رہے۔ سامنے کی سب سے اونچی چٹان پر چڑھ کے اس نے پلٹ کے دیکھا تو لانچ نے رخ موڑ لیا تھا اور اب وہ آہستہ آہستہ کنارے سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس نے چاہا کہ ایک بار پھر ناخدا کو ہاتھ ہلا کے الوداع کہے مگر اب وہ لانچ میں ترتیب سے رکھے ہوئے لکڑی کے بڑے صندوقوں کی دیوار کے پیچھے چھپ چکا تھا۔

ناخدا سفر کے دوران ناصر کے ساتھ بڑی مہربانی سے پیش آیا تھا۔ اس کا انداز بڑا دوستانہ تھا، اگرچہ اس کے چہرے پر جو کرختگی تھی، وہ اچھے خاصے نڈر آدمی کو بھی سہمانے کے لیے کافی تھی۔ اگر کہیں وہ اپنی ایک آنکھ کو چمڑے کے کالے ٹکڑے سے ڈھانپ لیتا تو بالکل قرونِ وسطیٰ کا کوئی بحری قزاق لگتا۔

''تو تم ابوعبید کے پاس جا رہے ہو، کشتیوں کے کارخانے میں؟'' ایک دن اس نے پوچھا۔

''تم جانتے ہو انھیں؟'' ناصر نے سوال کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ابوعبید سے بالکل واقف نہیں تھا مگر عمران نے یقین دلایا تھا کہ وہ اسے پیر ٹکانے کو جگہ ضرور دے گا۔ ناخدا نے کہا، ''جانتا ہوں کیا مطلب، میں تو ابوعبید سے اس وقت سے واقف ہوں جب اس کی صرف ایک بیوی تھی، اب تو ماشاء اللہ چار بیویاں ہیں۔ چار عورتیں اس کے گھر میں اور چار کشتیاں بہ یک وقت اس کے کارخانے میں اور دونوں کارخانے خوب چل رہے ہیں!'' وہ زور سے ہنسا، ''جاؤ، جاؤ، اچھی نبھے گی تمھاری اس سے — بڑا دل والا ارباب ہے وہ — اپنے لوگوں کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ میں بھی وہاں آتا رہتا ہوں۔'' پہلی بار ناخدا ذرا بے تکلف ہوا تو ناصر نے کہا، ''مجھے عمران نے آپ کا نام سند باد بتایا تھا۔''

''ہاں سب مجھے سند باد جہازی کہتے ہیں۔ میرے پاؤں میں اس طرح سمندر بندھے ہوئے ہیں کہ زمین پر اترنے کا موقع کم کم ہی ملتا ہے مگر جب آتا ہوں تو پانچ چھ

مہینے آرام کرتا ہوں اور ابوعبید کے دیوان خانے ہی میں خوب مجلس جمتی ہے — اللہ بھلا کرے اس کا — قہوے کا عاشق اور شیشے کا شوقین۔“

پہاڑی سے دوسری طرف اترتے ہی ناصر کو سڑک نظر آ گئی۔ سڑک سنسان پڑی تھی۔ ناصر نے دیکھا سڑک کے ساتھ ساتھ بجلی کے کھمبوں کی قطار دور تک چلی گئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ نیچے اترا اور ایک کھمبے کے پاس جا کے کھڑا ہو گیا۔ اتنے میں اسے دور سے ایک اونچی چھت والی سوزوکی وین اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وین اس کے قریب آ کے رُک گئی۔ ایک سردار جی اسے چلا رہے تھے اور برابر والی سیٹ پر ایک شخص عربی چوغے میں بیٹھا تھا، اس نے اپنے سر پر کالے چار خانے والا رومال اس طرح اونچا کر کے باندھ رکھا تھا کہ دور سے لگتا تھا کہ اس کے سر پر جنگلی کبوتر بیٹھا ہے۔

”سلام علیکم!“ عربی چوغے والا بولا۔ وہ باہر نکل آیا، ”انت ناصر؟“

ناصر ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ سردار جی بول پڑے، ”تسی ناصر جی ہو نا؟ ارباب نے تہاڈے واسطے گڈی بھیجی ہے گی۔“

ناصر نے پوچھا، ”ابوعبید نے؟“

”ہاں جی ہاں — ابوعبید نے —“ سردار جی بولے، ”اسی تین راتوں سے خوار ہو رہے ہیں ادھر۔ ارباب نے کہا تھا، روز جاؤ، منڈا کسی بھی دن آ جاوے گا۔“

عربی چوغے والے نے بیگ اس کے ہاتھ سے لے لیا اور گاڑی میں پھینک کے ناصر سے کہا کہ وہ پیچھے بیٹھ جائے۔

وین بہت دیر تک ریت کے اونچے نیچے ٹیلوں کے درمیان چلتی رہی، پھر ایک جگہ رک گئی۔ کسی فیکٹری کا احاطہ سامنے تھا۔ بڑا سا پھاٹک کھلا اور گاڑی اندر داخل ہوئی۔ یہ سمندر کے ساحل سے جڑا ہوا ایک کارخانہ تھا جس میں بہت ساری کشتیاں کھڑی تھیں۔ کچھ مکمل ہو چکی تھیں اور کچھ ادھوری تھیں۔ ایک طرف رہائشی کوارٹر تھے۔ لکڑی کے کیبن —

سردار جی نے ایک کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک آدمی باہر نکلا، ننگے بدن، بس اس نے ایک پھول دار لنگی پہن رکھی تھی جو گھٹنوں تک اُڑسی ہوئی تھی جس سے پتا چلتا تھا کہ گرمی بہت ہے۔



”لو جی نائر بھائی!“ سردار جی بولے، ”ارباب کا مہمان آ گیا ہے، اسے ٹھہراؤ اپنے کوارٹر میں — فجر کے وقت ارباب مسجد میں آئے گا تو اس وقت اسے ملانا!“ چوغے والے نے بیگ گاڑی سے اتار کے ناصر کو تھما دیا اور مسکرا کے بولا، ”ارباب صبح ملے گا۔“ گاڑی نے دھول اڑائی اور سردار جی اور چوغے والا دونوں ان کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

نائر نے اس کا بیگ اٹھایا اور کیبن کے اندر داخل ہوا، ”یہ میرا کوارٹر ہے، ابھی رات ادھر ہی گزارو۔“ پھر اس نے پوچھا، ”کہو تو کھانے کو کچھ لاؤں؟“

ناصر نے جواب دیا، ”نہیں ابھی تو مجھے بھوک نہیں ہے، سر میں تھوڑا درد ہے فی الحال۔“

”تو چائے چلے گی؟“ نائر نے کہا، ”تم ہاتھ منہ دھو لو۔“ اس نے باتھ روم کی طرف اشارہ کیا۔ ناصر واپس آیا تو اتنی دیر میں نائر نے اس کے لیے گرما گرم چائے تیار کر دی تھی اور قالین کے فرش پر فوم کا گدا بچھا کے اس کا بستر لگا دیا تھا۔

”کس نوکری پر آئے ہو؟“ نائر نے اسے چائے کی پیالی تھماتے ہوئے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“ ناصر بولا، ”دیکھتے ہیں کیا کام مل سکتا ہے یہاں۔“

”کہاں تک پڑھا ہے تم نے؟“ نائر نے پھر سوال کیا۔

”ایم اے ہوں۔“ ناصر بولا۔

”کچھ دیر خاموشی رہی پھر ناصر نے سوال کیا، ”تم کیا کام کرتے ہو یہاں؟“

”میں؟“ نائر بولا، ”میں ارباب کا ڈرائیور ہوں اور ان کا پرسنل اسسٹنٹ بھی۔“

”اچھا۔“ ناصر نے گفتگو جاری رکھنے کی خاطر پوچھا، ”تعلیم کتنی ہے تمھاری؟“

”چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ہوں۔“ نائر مسکرا کے بولا۔

”ارے!“ ناصر حیران ہوا، ”پھر بھی ڈرائیور بنے ہوئے ہو۔“

نائر ہنس پڑا، بولا، ”اس پر مجھے ایک مصیبت زدہ شیر سے اپنی ملاقات کا واقعہ یاد آ گیا۔ وہ شیر ببر یہاں کے چڑیا گھر سے فرار ہو گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا، جہاں پناہ! آپ کو تو یہاں افریقا کے جنگلوں سے بڑی شان سے لایا گیا تھا، پھر بھاگنے کی وجہ؟ رو کے بولا، جس دن میں پہنچا، چڑیا گھر کے ملازمین نے ناشتے میں صرف ایک عدد کیلا کھانے کو

دیا۔ میں نے یہ سوچ کے کیلا کھا لیا کہ شاید دوپہر میں تگڑا سا لنچ ملے مگر اب کی بار دو کیلے حصے میں آئے۔ مجھے غصہ تو بہت آیا مگر پھر اسی خیال سے چپ رہا کہ نیا نیا معاملہ ہے، خواہ مخواہ بات کا بتنگڑ بنانے سے کیا فائدہ مگر جب رات آئی تو ڈنر کے لیے تین کیلے دیے گئے۔ اب تو میں غصے سے پاگل ہوگیا اور دھاڑ کے بولا، ''پھر کیلے! تم شاید جانتے نہیں میں کون ہوں، ارے بھئی شیر ہوں میں، جنگل کا بادشاہ!''

''ہاں ہاں، شیر ہیں آپ، بجا فرمایا—'' کٹہرے کا رکھوالا ہاتھ جوڑ کے بولا، ''مگر بندر کے ویزے پر آئے ہیں!''

ناصر ہنسا، ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارا معاملہ ویزے کا ہے جیسا ویزہ، ویسی نوکری۔ مگر جو بغیر ویزے کے آیا ہو؟''

''اس کے لیے ہر نوکری—'' نائر نے جواب دیا اور ہنسنے لگا۔

ناصر، نائر سے ہاتھ ملا کے بولا، ''دل چسپ آدمی ہو بھائی، تم سے دوستی پکی ہوگئی، ویسے تمھارا پورا نام کیا ہے؟''

''میرا نام ہے سان گودی سری نواسن نائر، مگر پورا نام لو گے تو سانس پھول جائے گا، اس لیے بہتر ہے کہ صرف نائر کہو۔''

ناصر نے کہا، ''ہاں یہ ٹھیک ہے۔ نائر کا قافیہ بھی ناصر سے ملتا جلتا ہے۔''

''مگر یہاں لوگوں کو نام بگاڑنے کی بڑی پریکٹس ہے، اس لیے لوگوں کے نام تو نام، ان کی ولدیت بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے اور کبھی کبھی تو مذہب اور عقیدہ بھی۔'' نائر بولا، ''ایک دوست کو جس کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا، ویزا ملا تو اس پر اس کا نام میتھیو الرحمٰن لکھا ہوا تھا جب کہ اس کا نام تھا مطیع الرحمٰن۔ کچھ دن تو بے چارہ صبر کرتا رہا اور ارباب کی طرف سے کرسمس کے موقعے پر کیک اور عید کے موقع پر مٹھائیوں کے تحائف وصول کرتا رہا مگر جب ساتھی اصرار کرکے اسے اتوار کے روز گرجا گھر اور جمعے کے دن نماز پڑھنے کو مسجد لے جانے لگے تو اس نے یہاں سے فرار ہوجانے میں عافیت جانی۔'' نائر ہنسا پھر بولا، ''شکر ہے تمھارا نام ناصر ہے، اسے وہ نہیں بگاڑ سکتے، زیادہ سے زیادہ عبدالناصر کردیں گے اور مقامِ پیدائش قاہرہ۔''



دونوں کچھ دیر باتیں کرتے رہے پھر نائر نے کہا، ''اچھا اب تھوڑی دیر کے لیے سو جاؤ ظہر کے وقت اٹھا دوں گا۔ تمھیں ارباب کو سلام کرنے مسجد میں جانا ہوگا۔ وہ اپنے ورکروں کی حاضری نماز کے وقت لیتا ہے۔''

ناصر نے کہا، ''یقیناً نماز نیند سے بہتر ہے۔ نوکری کا معاملہ ہے بھائی۔''



# ۳

# موت کے کنویں کے باہر

ناصر نے آنکھیں بند کیں تو جیسے سو دروازے باہر کی طرف کھل گئے اور ہر ایک میں نیا منظر— کوئی اس کی آنکھوں پر بندھی پٹیاں کھول رہا تھا۔ سامنے ہی ایک سیاہ طشت میں موت کے ذائقے دھرے تھے— کلاشنکوف، چم چم کرتی کلھاڑی، شکاری چاقو— کتنے مہربان لوگ تھے جو اسے اپنی پسند کی موت کا موقع دے رہے تھے۔ جیپوں کی آوازیں، دوڑتے گھوڑے، بھونکتے کتے، سہمے ہوئے ہرن، کوئی ہرن سائیں راول کی شکل کا تھا، کوئی نوری کی شکل کا اور کوئی خود اس کی شکل کا— وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔ اچانک ایک گھڑسوار نے ایک کمند اس کی طرف اچھالی اور اس سے پہلے کہ پھندا اس کے گلے میں فٹ ہو جاتا کسی نے اسے جھنجھوڑا، ''فجر کا وقت ہو گیا ہے رفیق!'' ناصر نے آنکھیں کھولیں۔ نائر سامنے کھڑا تھا۔ پھول دار لنگی کے اوپر سفید کُرتہ اور پاؤں میں عربی چپل۔ ناصر ہڑبڑا کے اٹھ کھڑا ہوا۔

''چلو میں تیار ہوں۔'' وہ بولا، ''مسجد کتنی دور ہے؟''

''سامنے ہی تو ہے۔'' نائر نے کہا، ''کارخانے کے اندر ہی ارباب نے خود بنوائی ہے۔''

وہ دونوں کیبن سے باہر نکلے۔ صبح آہستہ آہستہ اُجلی ہو رہی تھی مگر ہوا بدستور گرم تھی۔ مسجد کے وضو خانے میں بہت سے نمازی وضو کر رہے تھے۔ نائر نے کہا، ''تمھیں ارباب





سے ملوانے کے بعد میں چہل قدمی کرنے چلا جاؤں گا، تم نماز پڑھ کے ارباب کے دفتر میں چلے جانا۔ وہ دونوں مسجد کے دروازے پر ہی کھڑے تھے کہ ایک بھاری بھرکم شخص بھورے رنگ کے عربی چوغے میں جسے کندورہ کہتے ہیں، تیزی کے ساتھ آگے بڑھا، اس کے ہاتھ میں عقیق کی تسبیح تھی اور پاؤں میں سیاہ سینڈل۔

نائر نے جلدی سے آگے بڑھ کے اسے سلام کیا اور مصافحہ کر کے بولا، ''رفیق ناصر آ گیا ہے ارباب!''

ابوعبید نے اپنے سرپوش کے کالے فیتوں کو تھوڑا سا کسا اور پھر دونوں ہاتھوں سے اسے سر پر جما کے بولا، ''اہلاً و سہلاً ناصر! نماز کے بعد کارخانے کے دفتر میں آؤ۔ مجھے تمھارا انتظار تھا۔'' یہ کہہ کر وہ مسجد میں چلا گیا۔ نائر نے ناصر کو اشارہ کیا کہ اس کے پیچھے پیچھے وہ بھی مسجد میں چلا جائے۔

نماز کے بعد ناصر مسجد سے نکلا تو نائر پاس ہی موجود تھا۔ ''ارباب کا دفتر سامنے ہے، آؤ میں تمھیں دکھاؤں۔''

ابوعبید کا دفتر لکڑی کے ایک بڑے سے کیبن میں واقع تھا مگر اسے بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ دیواروں پر ہر قسم کی بادبانی کشتیوں اور دخانی جہازوں کی تصویریں آویزاں تھیں اور مختلف بحری راستوں کے نقشے شیشے کے فریموں میں سجائے گئے تھے۔ الماریوں میں بحری سفر اور جہاز سازی کے بارے میں بے شمار کتابیں، انسائیکلو پیڈیا اور تصویری المانک موجود تھے جب کہ جہازوں پر استعمال ہونے والی مختلف اشیا جیسے گھڑیال، قطب نما، حفاظتی پیٹیاں، فولادی لنگر، پنکھے اور طرح طرح کی رسّیاں نمائش کے لیے چوبی تختوں پر رکھی ہوئی تھیں۔

ناصر اندر داخل ہوا تو ابوعبید وہاں پہلے سے موجود تھا۔ وہ بڑی سی میز کے پیچھے گھومنے والی کرسی پر بیٹھا ہوا عربی میں ایک بڑے سائز کا رسالہ پڑھ رہا تھا جس کے ٹائٹل پر ایک تجارتی جہاز کی رنگین تصویر چھپی ہوئی تھی۔

ابوعبید نے ناصر کی طرف مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ''آؤ آؤ دوست!'' وہ بولا، ''تمھارے بارے میں بڑی تشویش ناک اطلاعات ملی تھیں۔ عمران نے بتایا تھا کہ موت و

زندگی کا معاملہ تھا۔''

ناصر اس کے سامنے رکھی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ابوعبید نے کہا، ''میں نے تو کہا تھا کہ پہلے تمھارا ویزا نکال دوں مگر اس میں کچھ دیر لگتی اور عمران کا اصرار تھا کہ فوراً...''

ناصر نے جواب دیا، ''آپ کی مہربانی ارباب۔ مجھے تو ہنگامی حالات میں گھر چھوڑنا پڑا۔ عمران بھائی نے بڑی مدد کی۔ حالات ایسے تھے کہ میرا تو دماغ ہی کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ تو خدا بھلا کرے ان کا — مگر آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟''

دو سال پہلے وہ آیا تھا ادھر اپنی کمپنی کے ساتھ میلے میں اپنا موت کا کنواں لے کر۔ کیا بہادر آدمی ہے اور اس کا بیوی کیا نام ہے اس کا، ہاں، ویرا — وہ جرمن عورت، دونوں سے ہم سب کا اچھا دوستی بن گیا۔ وہ دونوں موت سے کھیلتا ہے روزانہ۔ کیا یہ اچھی بات نہیں۔ موت لوگوں سے کھیلتی ہے، وہ موت سے کھیلتے ہیں۔ وہ چھ مہینے ادھر رہا اور سب کا دوست بن گیا۔''

ایک آدمی اسی وقت قہوے کی کیتلی اور فنجان لے کر اندر آیا۔ پہلے اس نے ارباب کو اور پھر ناصر کو فنجان تھمایا اور قہوہ انڈیلا، ''عبداللہ! کچھ بسکٹ بھی لاؤ۔'' ارباب نے کہا، ''ہاں تو —'' وہ ناصر کی طرف پلٹا، میں نے ہی اسے سندباد سے ملوایا تھا، وہ بھی ہمارا دوست ہے — وہ تین مہینے سمندر میں اور تین مہینے خشکی پر گزارتا ہے۔ شادی وادی تو بنایا نہیں، اوپر فلک نیچے سمک۔''

''سمک کیا؟'' ناصر نے سوال کیا۔

''مچھلی رفیق مچھلی۔'' ابوعبید ہنسا، ''مچھلیوں کا عاشق ہے وہ۔''

ناصر نے کہا، ''ہاں اچھا آدمی ہے سندباد جہازی۔ مجھ سے کہہ رہا تھا کہ یہاں آئے گا تو ضرور ملے گا۔''

عبداللہ ایک طشتری میں کچھ بسکٹ اور کچھ فلافل لے آیا۔''

''لو کھاؤ۔'' ارباب نے کہا، ''یہ فلافل ہیں، سمجھو مونگ کی دال کے پکوڑے ہیں، کوفتوں کی شکل کے! عبداللہ کارخانے میں کینٹین چلاتا ہے، کھانے پینے کا اچھا سسٹم ہے ہمارے یہاں۔''

ناصر نے ایک فلافل طشتری میں سے اٹھایا۔ ارباب بولا، ''تمھارے رہنے کا انتظام



ابھی کرا دیتا ہوں۔''

''اور کام؟'' ناصر نے پوچھا، ''میں ایم اے ہوں، ایک لاری کمپنی میں منیجر تھا۔''

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔'' ارباب بولا، ''دیکھتے ہیں کیا ہوسکتا ہے۔ ابھی میرے کارخانے میں اسٹور سنبھالو۔ ساری لکڑیاں، کیل کانٹے اور دیگر سامان ادھر ہوتا ہے۔ اب تم اس کے نگراں ہو — ایک بار تمھارا ویزا آ گیا تو پھر کچھ اور دیکھیں گے۔''

ناصر، ابوعبید کا شکریہ ادا کر کے دفتر سے نکلا تو صبح کے ہاتھوں نے کارخانے پر سے اندھیرے کے پردے ہٹا دیے تھے اور اب ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی۔ کارخانہ دور تک پھیلا ہوا تھا اور ایک بڑے سے چھپر کے نیچے تین چار کشتیاں تعمیری مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ برابر میں خشک گودی تھی جہاں کچھ اور کشتیاں مرمت کے لیے موجود تھیں۔ سامنے سمندر تھا، نیلا اور پُرسکون۔ ناصر کافی دیر کارخانے کے مختلف حصوں کا چکر لگاتا رہا جہاں اب کارکنوں کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی۔ اچانک اسے سامنے سے نائر آتا دکھائی دیا، ''مبارک ہو۔'' وہ بولا، ''ارباب نے تمھیں اسٹور سپروائزر بنا دیا ہے۔ چلو میں تمھیں اسٹور کے کارندوں سے ملوا دوں۔''

کارخانے کا اسٹور بہت بڑا تھا اور اس میں طرح طرح کی لکڑی کے تختے، رسیاں، رنگوں اور پالشوں کے ڈبے، بادبانوں کے کپڑے، بجلی کا سامان، جنریٹر اور بہت سی دیگر چیزیں رکھی ہوئی تھیں۔ وہاں دس آدمی کام کرتے تھے۔ سب نے گرم جوشی سے ناصر سے مصافحہ کیا۔ نائر نے کہا، ''تمھارے رہنے کے لیے علاحدہ کیبن کا بھی انتظام کر دیا گیا ہے۔ ہر چیز وہاں موجود ہے، بستر، پانی کا کولر، ایئر کنڈیشنر — پھر میں تو تمھارے سر پر سوار رہوں گا، کسی بھی چیز کی ضرورت ہو تو تکلف مت کرنا۔''

صرف پندرہ دن میں ناصر کارخانے کے سب لوگوں سے واقف ہو گیا اور اسٹور میں رکھی ہر چیز اس کی انگلیوں کے پوروں پر منتقل ہو گئی۔ کشتیوں کے کاریگر روزانہ اس کے پاس آ کے ضرورت کے مطابق زیرِ تعمیر یا زیرِ مرمت کشتیوں کے لیے ساز و سامان طلب کرتے اور چٹکیوں میں ان کا کام ہو جاتا۔

ابوعبید بڑا مہربان اور دل چسپ شخص تھا۔ وہ عمران کی وجہ سے ناصر کا بہت خیال رکھتا۔ وہ اسے خاص طور پر اپنے دیوان خانے کی محفلوں میں شریک کرتا۔ ہر جمعے کی شام

ابوعبید کی بیٹھک میں جو کارخانے کے ہی ایک حصے میں واقع تھا، کھلی کچہری بجتی تھی جس میں سب کو اجازت تھی کہ اپنی اپنی سنائیں، گائیں اور دل بہلانے کو اپنے سازوں کے سُر ملائیں۔ ناصر جس شام وہاں گیا اس نے ایک مقامی نوجوان کو لہک لہک کے گیت گاتے پایا۔ ایک اور لڑکا دف بجا بجا کے اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ نائر نے بتایا کہ گانے والا کارخانے میں آرا مشین پر لکڑی چیرنے کا کام کرتا ہے اور شاعر بھی ہے۔ اس وقت وہ مقامی بولی نباتی میں، جس میں عربی کے علاوہ ہندی اور سواحلی کے ذائقے بھی ملتے ہیں، کسی کے دل فریب سراپے کی تعریف کر رہا ہے، ''آہا کیسی دل میں اتر جانے والی آنکھیں ہیں تیری، کیسی جادو بھری تیری چال اور کیسا خوب صورت ہے تیرا دہانہ!''

''یقیناً ان اشعار میں محبوب کے سراپے کو بیان کیا گیا ہوگا!'' ناصر نے کہا۔

''محبوب کا نہیں، اپنے اونٹ کا۔'' نائر بولا، ''صحرا کا جہاز ان صحرائیوں کے لیے کسی نعمت کے برابر ہے، وہ اس کی جتنی ثنا کریں، کم ہے۔ وہ تو ان کے لیے محبوب سے بڑھ کر ہے۔''

ناصر نے کہا، ''ہمارے شاہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام میں بھی اونٹوں کے قصیدوں کی بھرمار ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

اُشترِ لاجواب، لاثانی
ہاتھ خوش قسمتی سے آیا ہے

اصل میں وہ اونٹ کو محبوب تک پہنچنے کا وسیلہ سمجھتے ہیں، لہٰذا اسے اتنا ہی محبوب جانتے ہیں۔''

ایک صبح ناصر ابھی کارخانے کے گودام میں موجود اشیا کا حساب لگا رہا تھا کہ نائر اس کے پاس آیا، ''ارباب تمھیں بلا رہا ہے۔'' اس نے کہا۔

ناصر فوراً ابوعبید کے پاس پہنچا تو وہ ایک لفافہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ ''لو بھئی تمھارا خط آیا ہے۔ میں نے سوچا فوراً تمھیں پہنچا دوں، یہ ثواب کا کام ہے۔'' وہ مسکرا کے بولا۔

ناصر نے لفافہ ابوعبید کے ہاتھ سے لیا اور ایک نظر اس پر لکھے ہوئے پتے پر ڈالی۔ لکھا تھا، ''موت کے کنویں کے ایک کھلاڑی ناصر کے لیے، موت کے کنویں کے دوسرے کھلاڑی عمران کی طرف سے!'' خط ابوعبید کے کشتیوں کے کارخانے کے پتے پر آیا تھا۔

○

# ۴

# خط، خطرہ اور خبرنامہ

ناصر نے ابوعبید کے دفتر سے باہر نکل کے بے تابی سے لفافہ چاک کیا تو اندر سے یہ تحریر برآمد ہوئی:

مقام : موت کا کنواں
بستی : قزاقوں کی
وقت و تاریخ : لمحۂ موجود جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

پیارے ناصر یقیناً تم وہاں پہنچ چکے ہوں گے جہاں تمھیں پہنچنا چاہیے تھا، ان لوگوں سے بچ کے جو تمھیں کہیں اور پہنچانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن یقین کرو بہت سے لوگ اتنے خوش قسمت نہیں ہیں۔

مجھے تو اب تک یقین نہیں آ رہا ہے کہ تم یہاں سے چلے گئے ہو مگر اچھا ہوا چلے گئے۔ اس رات کے بعد بھی جب موت نے تمھارے گھر آنگن میں اندھا رقص کیا تھا، تمھارے لیے یہاں امن نہیں تھا۔ وہ لوگ تمھارا پیچھا کرتے ہوئے ساحل تک پہنچے تھے مگر بھلا ہو سندباد کا جو عین وقت پر تمھیں اپنی کشتی کے بادبانوں میں لپیٹ کے قزاقوں کی بستی سے بچا لے گیا۔

تمھارے جانے کے بعد جو دن گزر رہے ہیں، اگر ان کا مختصر حال بھی لکھوں تو یہ تحریر

بڑی طویل ہوجائے گی۔ لہٰذا چند نقطوں کو جوڑ کے حالات کی ایک ادھوری تصویر تمھارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

تمھارے دوست اور سرپرست بادشاہ خان کے طوفان میل اب کوئٹہ اور پشاور سے پرے شمالی کوہستانوں کی سیر کرتے پھرتے ہیں اور ان کے ذریعے اعلیٰ نسل کی بندوقیں اور توپیں افغان جنگجوؤں کو پہنچائی جارہی ہیں، وجہ یہ ہے کہ اس کے ٹرکوں کو سرکاری تحویل میں لے لیا گیا ہے۔

لاری کمپنی میں تمھارے جانشین خیر بخش جمالی کی اطلاع ہے کہ اگر تم یہاں سے نہ جاتے تو تمھیں ہلاک کرنے کے لیے وڈیرے نے بعض نئے زیادہ ہنرمند نشانے باز ڈھونڈ رکھے تھے کیوں کہ اپنے کارندوں کی نااہلی نے اسے سخت مایوس کیا تھا۔ ویسے بھی اب 'نامعلوم' نشانہ بازوں کے ایسے بے شمار کلب کھل گئے ہیں جہاں کھلم کھلا یہی کاروبار ہوتا ہے اور کسی پر کوئی الزام نہیں آتا۔

ماروی کی بالکل فکر مت کرنا، وہ تمھاری امانت ہے ہمارے پاس — اسے ویرا نے اپنی بیٹی بنالیا ہے اور اس کی خواہش ہے کہ وہ ویسی ہی نڈر اور بہادر بنے جیسی کہ وہ خود ہے۔

پروفیسر عظمت علی کالج سے ریٹائر ہوکے سینئر تجزیہ کار کی حیثیت سے ایک بڑے اخبار سے منسلک ہوگئے ہیں اور ان کے کالم کی وجہ سے وہ اخبار اب ہاتھوں ہاتھ لیا جارہا ہے۔ بہت سے لوگ اسے پڑھنے اور ان سے زیادہ اسے جلانے کے لیے لے جاتے ہیں۔

کل دارالحکومت میں سورج تو نکلا مگر دن کالا ہوگیا جس کی وجہ یہ تھی کہ وہاں ایک مشہورِ زمانہ بارودخانہ ایک دھماکے سے اُڑ گیا اور پوری بستی پر راکٹوں اور بم کے شیلوں کی بوچھاڑ ہوگئی، مکان ڈھے گئے اور بے شمار لوگ مارے گئے۔ سیاسی پارٹیاں نجانے کب سے مختلف معاملات پر احتجاجاً 'یومِ سیاہ' مناتی آرہی ہیں مگر سچ مانو تو ہمیں اب پتا چلا کہ اصل میں 'یومِ سیاہ' کیسا ہوتا ہے۔

پروفیسر عظمت علی اپنے کالم کے لیے مواد اکٹھا کرنے اور یہ پتا کرنے کہ یہ کن بدبختوں کی کارروائی ہے، دارالحکومت جانے کے لیے پر تول رہے ہیں مگر میں نے اور ان



کے دیگر بہی خواہوں نے انھیں یہی مشورہ دیا ہے کہ انھیں اس معاملے میں ٹانگ اڑانے کی ضرورت نہیں۔ بارود خانے تو اُڑنے اور اُڑانے کے لیے ہی ہوتے ہیں۔ کیا پتا وہاں سے پہلے ہی کتنے بم اور راکٹ اُڑائے جاچکے ہوں۔

پچھلے دنوں ہمارے سرکس کا ایک نوجوان چمپانزی غائب ہوگیا تو لوگوں نے یہی سمجھا کہ اسے خفیہ ایجنسی والے پکڑ لے گئے ہوں گے، اس لیے کہ آج کل یہی ہورہا ہے۔ دو دن پہلے ایک قریبی محلے کے ایک لڑکے کو خفیہ ایجنسی کے لوگ صرف یہ پوچھنے کے لیے اٹھا کر لے گئے کہ اس کا کس جماعت سے تعلق ہے۔ ان کے خیال میں کوئی جوان آدمی ان دنوں کسی نہ کسی بری یا بھلی جماعت سے تعلق قائم کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس کے مسلسل انکار کے بعد کہ اس کا کسی جماعت سے تعلق نہیں، انھوں نے تنگ آ کے اسے رہا کردیا مگر ان کی صحبت میں دو راتیں گزارنے کے نتیجے میں، اس بے چارے کے چار دانت کم ہوگئے ہیں جنھیں لگوانے کے لیے وہ کسی ماہر دنداں ساز سے مشورہ کر رہا ہے۔ خیر خدا کا شکر ہے ہمارے سرکس کے چمپانزی کے ساتھ ایسا کوئی حادثہ پیش نہیں آیا اور اسے ایک تاریک کٹہرے سے برآمد کرلیا گیا ہے جہاں وہ اپنی ناراض بیگم کو منانے کی کوشش کر رہا تھا۔

چلو اب ایک دل چسپ خبر سنو۔ تمھیں جانے سے پہلے اس بات کا بڑا قلق تھا کہ شہر کے سب اچھے سینما گھر بند ہوتے جارہے ہیں اور ان کی جگہ بے تکے شاپنگ پلازے اور مارکیٹ کھل رہے ہیں تاکہ ان میں اسمگلنگ کا سامان لوگوں کو باآسانی مل سکے۔ خیر، تمھیں سن کے ضرور خوشی ہوگی کہ اب گھر گھر تھیٹر کھل گئے ہیں کیوں کہ ان مارکیٹوں میں آج کل سب سے زیادہ فروخت ہونے والی چیز بیٹا میکس اور وی ایچ ایس، وی سی آر ہیں جن سے ساری دکانیں بھری پڑی ہیں۔

دوسری طرف نمازیوں کی تعداد میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوا ہے، خاص طور پر سرکاری محکموں اور نجی کمپنیوں کے دفاتر میں — اور شاید اسی وجہ سے شہروں میں بہت سی فالتو مسجدوں کو نمازیوں سمیت شہید ہونے کا رتبہ عطا کیا جارہا ہے۔ اللہ سب کو جنت رسید کرے۔

فی الحال اتنے کو بہت سمجھو مگر ہاں ایک بات اور یاد آئی — اپنے پروفیسر عظمت علی

تمھارے بڑے مداح ہیں اور تمھارے اور نوری کے قصے نے انھیں اتنا متاثر کیا ہے کہ وہ اب اس پر پورا ناول لکھ رہے ہیں۔

ویرا کا بھی سلام قبول کرو ـــ اور دیکھو اس خط کا جواب دینے کی ہرگز کوشش نہ کرنا کیوں کہ اس سے صرف دشمنوں کو فائدہ ہوگا جو تمھاری کھوج میں ہیں۔ میرے مختصر خبرنامے تمھیں وقفے وقفے سے ملتے رہیں گے۔

تمھارا

عمران

(موت کے کنویں سے)



# ۵

# عملی زندگی محبت سے شروع ہوتی ہے

ناصر خط پڑھتے ہوئے اپنے دفتر تک پہنچ گیا۔ اس نے خط تہ کرکے میز کے خانے میں رکھ دیا۔ کارخانے کی طرف سے آرا مشین کے چلنے اور کاری گروں کی ٹھوکا پیٹی کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اس نے کھڑکی بند کردی اور شور باہر رہ گیا۔ باہر کے سب منظر بھی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ اس نے پانی کے گلاس کی طرف دیکھا جو ابھی ابھی کوئی اس کی میز پر رکھ گیا تھا۔ اس نے گلاس اٹھایا۔ پانی کی شفاف سطح آئینے کی طرح چمک رہی تھی۔ اس نے اسے میز پر واپس رکھ دیا۔ ایک پرانا منظر اس کی آنکھوں میں روشن ہوگیا۔

وہ وزیر مینشن کے سرکلر ریلوے اسٹیشن کے باہر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ٹرین پکڑ کے کریم آباد جائے۔ وہ چھ بجے بادشاہ خان گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر سے نکلا تھا اور آٹھ بجے اسے اپنے کالج پہنچنا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ ایک موٹر سائیکل اس کے پاس آ کے رکی۔ اس پر کسرتی بدن کا ایک شخص جس نے چمڑے کی کالی جیکٹ اور چست نیلی جین پہن رکھی تھی، بڑے ٹھسّے سے بیٹھا تھا۔ وہ بولا، ”اگر آپ کہیں جانا چاہیں تو میں یہ نیکی کما سکتا ہوں۔“

”مگر مجھے بہت دور جانا ہے بھائی ـــ کریم آباد تک ـــ آپ پتا نہیں کہاں جا رہے ہوں گے۔“

’’کوئی بات نہیں۔‘‘ موٹر سائیکل سوار اپنائیت سے بولا، ’’میں نمائش تک تو آپ کو پہنچا ہی سکتا ہوں، وہاں سے آپ کوئی بھی سواری لے کر آگے جا سکتے ہیں، وقت بچ جائے گا۔‘‘

پہلے تو ناصر نے سوچا کہ منع کر دے مگر اس شخص کے لہجے میں اسے ایسی اپنائیت لگی کہ اس سے انکار نہ کیا گیا اور وہ اس کے پیچھے بیٹھ گیا۔

’’آپ کریم آباد میں رہتے ہیں کیا؟‘‘ موٹر سائیکل سوار نے سوال کیا۔

’’نہیں، میں وہاں ایک کالج میں پڑھتا ہوں۔‘‘ ناصر نے جواب دیا۔

’’اچھا۔‘‘ وہ آدمی بولا، ’’ضرور سراج الدولہ کالج میں پڑھتے ہوں گے، کیوں؟‘‘

’’جی ہاں!‘‘ اس نے مختصر جواب دیا۔

’’کس کلاس میں؟‘‘ پھر سوال آیا۔

’’فرسٹ ایئر میں پڑھتا ہوں، اس وقت انگریزی کا پیریڈ ہوتا ہے میرا۔‘‘ ناصر بولا۔

’’اچھا۔‘‘ وہ آدمی خوش ہو کے بولا، ’’میرا ایک دوست پڑھاتا ہے وہاں۔ آپ اس سے ضرور ملیں۔ عظمت علی نام ہے اس کا، پروفیسر عظمت علی۔‘‘

’’ارے، وہ تو میرے استاد ہیں، انگریزی کے۔‘‘ ناصر نے جواب دیا، ’’بڑے ادیب بھی ہیں، کہانیاں وغیرہ لکھتے ہیں۔‘‘

’’ہاں وہی۔‘‘ موٹر سائیکل والے نے کہا، ’’ہم دونوں ساتھ پڑھتے تھے اسلامیہ کالج میں، بی اے تک ساتھ رہے۔ میرا بہت اچھا دوست ہے وہ۔ بڑا سچا اور کھرا بندہ ہے، بہت پڑھاکو اور محنتی اور بہت اچھا لکھاری۔ اس کی کہانیاں بڑے بڑے رسالوں میں چھپتی ہیں۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ ناصر نے مرعوب ہو کے کہا، ’’میں ان سے آپ کا ذکر کروں گا۔‘‘

’’ہاں ضرور۔‘‘ کہنا عمران بہت یاد کر رہا تھا آپ کو۔ بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔‘‘

عمران نے موٹر سائیکل کی رفتار بڑھائی اور ایک دھواں اُگلتی بس کے آگے نکل گیا۔

اس وقت وہ صدر میں ریگل چوک سے ہوتے ہوئے ایم اے جناح روڈ کی طرف جا رہے تھے۔ عمران پھر بولا، ’’عظمت بہت اچھا شخص ہے، تمھیں پڑھائی کے معاملے میں کسی مدد کی



ضرورت ہو تو اس پر بھروسا کر سکتے ہو، وہ دوسروں سے بہت مختلف آدمی ہے۔‘‘

ناصر نے اچانک سوال کیا، ’’آپ نے بی اے کے بعد کیوں پڑھائی چھوڑ دی؟‘‘

’’میں نے ـــ؟‘‘ عمران نے ایک لمحے سوچا، پھر بولا، ’’بات یہ ہے کہ بعض لوگ پڑھائی ختم کرنے کے بعد عملی زندگی کا ذائقہ چکھنا چاہتے ہیں مگر میں ان میں سے نہیں ہوں۔ میں ابھی آدھے راستے میں ہی تھا کہ عملی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے اپنا اسیر بنا لیا۔ مگر میں بہت خوش ہوں۔‘‘

ناصر نے پوچھا، ’’مگر ایسا ہوا کیسے؟‘‘

’’اصل میں مجھے محبت ہو گئی تھی۔‘‘ عمران نے موٹر سائیکل کو جیسے ایڑ لگاتے ہوئے انکشاف کیا۔

’’کیا ـــ؟‘‘ ناصر حیران ہوا۔

’’ہاں بھئی، تم بھی جوان آدمی ہو یقیناً میری بات سمجھ سکتے ہو۔ جوانی کچھ کر گزرنے پر اکساتی ہے نا۔ تو مجھے ایک لڑکی سے محبت ہو گئی اور میں نے سوچا کہ زندگی کا اصل مقصد تو اب سمجھ میں آیا۔‘‘

’’پھر کیا ہوا؟‘‘ ناصر کو عمران کی باتوں میں مزہ آ رہا تھا۔ عمران نے کہا، ’’پھر یہ ہوا کہ میں نے اس لڑکی سے شادی کر لی۔‘‘

ناصر ہنسا، ’’اور اس طرح آپ کی عملی زندگی اچانک شروع ہو گئی۔‘‘

’’ہاں ـــ اور اصل میں اس کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے کہ زندگی حقیقت میں ہے کیا؟‘‘ عمران ہنسا۔

’’کیا ہے؟‘‘ ناصر نے پوچھا۔

’’موت کا کنواں؟‘‘ عمران بولا، ’’بڑا مشکل کام ہے اپنی ذمے داریوں کو نبھانا اور کامیابی کے ساتھ زندہ رہنا۔‘‘

ناصر چپ چاپ سنتا رہا۔ عمران نے پوچھا، ’’تم ابھی صرف پڑھتے ہو یا ـــ؟‘‘

ناصر نے کہا، ’’میں دن کے وقت ایک گڈس ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام بھی کرتا ہوں۔‘‘

عمران بولا، ''یہ ٹھیک ہے، نوکری کے ساتھ ساتھ پڑھائی کا بھی ایک مزہ ہے۔''

اب وہ نمائش کے بس اسٹاپ پر پہنچ چکے تھے۔ ناصر نے کہا، ''بس آپ مجھے یہیں اتار دیں، لفٹ دینے کا شکریہ۔ آپ کی باتیں بہت اچھی لگیں۔''

عمران نے موٹر سائیکل پر بیٹھے بیٹھے ہی ناصر سے ہاتھ ملایا، ''کبھی کبھی ملتے رہا کرو۔'' وہ بولا، ''قائداعظم کے مزار کے قریب جو بڑا میدان ہے، اس میں گلوب سرکس لگا ہے، میں اس میں کام کرتا ہوں۔''

''کیا، سرکس میں؟'' ناصر کو یقین نہیں آیا، ''آپ وہاں کیا کرتے ہیں؟''

''موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا ہوں، اپنی بیوی کے ساتھ۔'' اس نے کہا اور آگے بڑھ گیا۔



# ٦

# پھٹ پھٹی پر عشق

موت کے کنویں کے اوپر تماش بینوں کی بالکونی کھچا کھچ بھری ہوئی تھی۔ شو شروع ہونے والا تھا کہ عمران کنویں کے اندر نچلے دروازے سے داخل ہوا۔ اسی لمحے اس شو کی ہر دل عزیز کرتب باز پرنسز ویرا نے اپنی کالی موٹر سائیکل کو ایڑ لگائی اور موٹر سائیکل ہلکی سی گرج کے ساتھ کنویں کی تہ میں گولائی میں بنے ڈھلوان راستے پر چڑھ گئی۔ اس نے ہاتھ اٹھا کے عمران کو اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور زن سے دیوار پر چڑھ گئی۔

کنویں میں اس کا پہلا چکر مکمل ہونے سے پہلے ہی عمران نے بھی اپنی موٹر سائیکل کو آگے بڑھایا اور پھر زبردست شور کے ساتھ چوبی دیوار پر چڑھ گیا۔ اب دونوں موٹر سائیکلیں چوبی کنویں میں ایک دوسرے کے پیچھے چکر کاٹ رہی تھیں۔

ویرا کی موٹر سائیکل سیاہ تھی اور اس نے لال کوٹ پہن رکھا تھا جب کہ عمران کی موٹر سائیکل لال رنگ کی تھی اور اس نے نیلی جین پر چمڑے کی کالی جیکٹ چڑھا رکھی تھی۔ وہ دونوں کنویں کی گہرائی کو اتنی تیز رفتاری سے ناپ رہے تھے کہ دیکھنے والوں کو اوپر سے صرف دو شعلے حرکت کرتے نظر آ رہے تھے۔ کبھی ویرا اوپر چلی جاتی تو کبھی عمران تماش بینوں کی بالکونی کی منڈیر کو چھو آتا۔ موٹر سائیکلوں کی دھمک سے کنویں کی چوبی دیواریں لرز رہی تھیں۔

تماش بینوں کی آنکھیں دونوں موٹر سائیکل سواروں پر جمی ہوئی تھیں۔ اچانک کسی نے ڈالی سمیت گلاب کا ایک پھول آگے بڑھایا اور ویرا نے ہاتھ بڑھا کے اسے لپک لیا۔

عمران مسکرایا، یہی تو ویرا کی وہ ادا تھی جس نے کبھی عمران کی زندگی بدل ڈالی تھی۔

عمران خود ایک پھول بن گیا جسے ویرا نے بڑی خوش دلی سے اُچک لیا تھا۔ اس دن کیسا عجیب واقعہ ہوا تھا۔ عمران موت کے کنویں میں موٹر سائیکل کا تماشا دیکھنے آیا تھا مگر شو ختم ہونے کے بعد وہ کرتب بازوں کے خیمے میں پہنچ گیا۔ ویرا اپنے باپ کے ساتھ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے پر شو کی مشقت کا پسینہ تھا جس نے اس کے گالوں کو دہکا رکھا تھا۔ اس نے اپنے سنہرے بالوں کو عنابی رومال سے باندھ رکھا تھا۔ عمران اس کے پاس گیا اور بغیر شرمائے کہنے لگا، ''مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔''

ویرا نے اسے حیرت سے دیکھا، ''کیا بات کرنی ہے؟''

عمران ذرا سا جھجکا مگر پھر دھیرے سے بولا، ''مجھے اکیلے میں بات کرنی ہے۔''

''اکیلے میں کیوں؟'' ویرا نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھا، پھر کچھ سوچ کے بولی، ''جو کہنا ہے یہیں کہو، یہ میرے پاپا ہیں۔'' اس نے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے اس شخص کو غور سے دیکھا۔ گورا چٹا، مضبوط بدن والا، لمبے قد کا بڈھا۔ اس کے ہاتھ کھردرے اور آنکھیں عقابی تھیں۔

''کہو، کیا کہنا ہے؟'' اب کے وہ خود عمران سے مخاطب ہوا۔

عمران نے ویرا کی طرف جھک کے دھیرے سے کہا جیسے کوئی راز کی بات بتاتے ہیں، ''آپ بہت اچھی موٹر سائیکل چلاتی ہیں۔''

بوڑھا اس بات پر بہت زور سے ہنسا، ''ارے تو اس میں شرمانے کی کون سی بات ہے، برخوردار، ذرا زور سے کہو تاکہ سارا زمانہ سن لے۔ پرنسز ویرا تو سچ مچ میں بہت اچھی موٹر سائیکل چلاتی ہے۔۔۔ مجھ سے بھی اچھی۔''

عمران کو ویرا کے لیے پرنسز کا خطاب بہت اچھا لگا۔ پرنسز ویرا، اس نے دل میں دُہرایا۔ اس نے سوچا باہر موت کے کنویں کے بورڈ پر بھی یہی لکھا ہونا چاہیے، ''پرنسز ویرا کا



شو۔'' وہ اپنے آپ میں گم تھا کہ ویرا کی آواز اس کے کان میں آئی، ''تھینک یو میرے دوست۔ کیا تم پہلی بار میرا شو دیکھنے آئے ہو۔ شو اچھا لگا تو روز آتے رہو۔ اور خوش رہو۔'' وہ مسکرا رہی تھی۔ عمران نے کہا، ''مگر ایک بات اور بھی ہے۔''

''وہ کیا؟'' ویرا حیران ہوئی۔

''میں بھی موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانا چاہتا ہوں۔'' وہ بولا۔

بوڑھا پھر زور سے ہنسا، ''کیا تم نے کبھی شیر کی سواری کی ہے؟'' اس نے پوچھا، ''میرا مطلب ہے، تم نے کبھی موٹر سائیکل چلائی ہے، کوئی تجربہ ہے تمھارا؟''

''کیوں نہیں۔'' عمران نے جواب دیا، ''بہت چلائی ہے موٹر سائیکل۔۔۔ اپنے بھائی کی چرا کے۔''

بوڑھے نے قہقہہ لگایا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے بولا۔ مجھے خوش مزاج لڑکے بہت پسند ہیں مگر یہ معاملہ تمھارے بس کا نہیں۔ یہ سچ مچ میں شیر کی سواری ہے۔ اس میں آدمی کی ہمت، حوصلے اور اعتماد کا امتحان ہوتا ہے، یہ معمولی فن نہیں، بڑی محنت لگتی ہے اسے سیکھنے میں۔'' مگر عمران اپنی ضد پر اڑا رہا۔ اس نے کہا، ''اگر آپ میری مدد کریں تو میں بہت جلد سب کچھ سیکھ لوں گا۔''

ویرا نے یکایک اپنا عنابی رومال کھول دیا اور اس کے سنہرے بال کسی آبشار کی صورت اس کے شانوں پر پھیل گئے۔ ''اچھا بابا!'' اس نے مسکرا کے بڑی ادا سے کہا، ''میں بابا سے تمھاری سفارش کروں گی مگر اس کے لیے تمھیں سات دن تک مسلسل میرے سارے شو دیکھنے ہوں گے اور تماش بینوں کی گیلری سے مجھے پھول دینا ہوگا۔ پھر سات دن بعد تمھیں سات دن تک شو سے پہلے میری موٹر سائیکل چمکانا ہوگی، پھر سات دن میرے پیچھے ڈیڈ کے موٹر سائیکل پر موت کے کنویں میں چکر کاٹنا ہوگا، اس کے بعد ہی تمھاری اصل تربیت شروع ہو سکے گی۔'' عمران کو یہ سودا مہنگا نہیں لگا۔ پہلے سات دن تک وہ صرف اس کے لیے پھول لاتا اور اس کی نذر کرتا رہا، اس کے بعد سات دن تک وہ شو سے پہلے ویرا کی موٹر سائیکل چمکاتا رہا۔ تربیت کے اس مرحلے کے آخری دن ویرا نے کہا، ''اب تم کل سے میرے

ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھ سکو گے اور یہاں سے تمھاری ہمت کا امتحان شروع ہوگا، خیال رہے۔"

عمران اس امتحان میں بھی کامیاب رہا۔ وہ موٹر سائیکل پر ویرا کے پیچھے بیٹھتے ہی ایک نئی دنیا کے سفر پر روانہ ہوجاتا۔ عجب دنیا تھی وہ، روشنیوں اور خوش بوؤں سے بھرپور۔ پہلے ہی دن اس کی کایا پلٹ گئی۔ موٹر سائیکل اچھل کے موت کے کنویں سے نکلی اور ایسے راستے پر چل نکلی جو آسمانوں کی طرف جاتا تھا۔ وقت اچانک تھم گیا اور رفتار کا احساس ختم ہوگیا۔ ان کے بدن اگرچہ سفر میں تھے مگر روحیں ٹھہراؤ کے ایک ابدی لمحے میں ایک دوسرے میں مدغم ہوگئی تھیں۔ آگے ستاروں کے جہاں تھے، کہکشاں کی دنیا، جھلملاتی روشنیاں اور انکشاف کے نئے آسمان — زندگی موت کی گرفت سے نکل گئی تھی۔

عمران نے سوچ لیا تھا کہ اس سفر میں ٹھہراؤ کی ضرورت نہیں، اس کے دو نتائج ظاہر ہوئے۔ وہ شیر کی سواری کرنے کے قابل ہوگیا اور شیرنی نے اپنے دل کے دروازے اس کے لیے ہمیشہ کے واسطے کھول دیے۔ پھٹ پھٹی پر عشق کامیاب رہا۔



## ۷

# بستے میں سانپ

انگریزی کی کلاس جاری تھی اور پروفیسر عظمت علی رپ وان ونکل کی کہانی پڑھا رہے تھے۔ اور جب رپ وان ونکل کی آنکھ کھلی اور وہ اپنی بستی میں واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ وہاں تو دنیا ہی بدل چکی ہے۔ اس کے زمانے کے لوگ تو کب کے بوڑھے ہو کے مر کھپ چکے ہیں اور گلیوں اور مکانوں کی شکلیں کچھ سے کچھ ہوگئی ہیں۔

"سر!" ایک لڑکے نے ہاتھ اٹھایا، "کیا سچ مچ میں ایسا ہوسکتا ہے کہ ایک روز ہم سو کے اٹھیں اور پتا چلے کہ گھر کے باہر سب کچھ بدل گیا ہے۔ ہر طرف نئے لوگ ہیں اور ان کی نئی خواہشیں؟"

"کیوں نہیں ہوسکتا؟" استاد نے کہا، "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے، دیکھتے ہی دیکھتے چہرے بدل جاتے ہیں، سوچ بدل جاتی ہے، کردار بدل جاتے ہیں، آپ سو کے اٹھتے ہیں تو اخباروں سے پتا چلتا ہے کہ جو پہلے تھا، وہ اب نہیں ہے اور جو اب ہے، وہی اب ہے۔ اسے 'آپریشن فیئر پلے' کہتے ہیں یعنی جدلیاتی نظام کا عدلیاتی نظام — گویا نیا کھیل اور اس کے نئے کردار جس میں پرانا سچ جھوٹا اور نیا جھوٹ بالکل سچا ثابت کیا جائے گا۔"

"سر! اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ کہانیوں کے کرداروں کو کبھی جھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے، اس سے کردار تو کہانی سے باہر آ کے اصل زندگی میں مداخلت شروع کر دیتے ہیں اور پوری

زندگی کو بدل ڈالتے ہیں۔" لڑکے نے کہا۔

"بالکل ٹھیک۔" پروفیسر عظمت علی نے کہا، "کرداروں کے ساتھ مسئلہ یہی ہے کہ وہ بڑے بے بھروسا ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ڈگر پر قائم نہیں رہتے، کبھی زندگی انھیں بگاڑ دیتی ہے، کبھی وہ زندگی کو بگاڑ دیتے ہیں۔ انھیں نوے دنوں کی مہلت ملے یا نوے مہینوں کی، بدلنے سے باز نہیں آتے۔ تم لاکھ اپنے کسی دوست کو زندگی کے لگے بندھے راستوں پر چلنے کی تلقین کرو تاکہ گاڑی پٹڑی سے نہ اترے مگر کچھ عجب نہیں کہ وہ کل تمھیں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا ہوا ملے، زندگی ہمیں حیران کر دیتی ہے۔"

کلاس ختم ہونے کے بعد ناصر، پروفیسر عظمت علی کے پاس گیا، "سر میں آپ کے اس دوست کو جانتا ہوں۔"

"کس دوست کو؟" پروفیسر نے سگار سلگاتے ہوئے پوچھا۔

"وہی جو موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتا ہے۔" ناصر نے جواب دیا۔

پروفیسر عظمت علی مسکرائے، "تمھارا نام ناصر ہے نا؟"

"جی سر!" ناصر بولا، "ایک دن عمران صاحب نے مجھے اپنی موٹر سائیکل پر لفٹ دی تھی۔"

"موت کے کنویں میں؟" پروفیسر عظمت نے کہا۔

"نہیں، نہیں۔" ناصر بولا، "میرے بس اسٹاپ تک — مجھے تو وہ بہت اچھے لگے۔"

پروفیسر عظمت علی نے کہا، "عمران میرا بہت پیارا دوست ہے، میں اس کی خوبیاں جانتا ہوں۔ اس کی یہی خوبی کیا کم ہے کہ وہ زندگی کے لیے روز موت سے کھیلتا ہے۔ وہ ہمیشہ سے بڑا نڈر ہے۔"

ناصر نے کہا، "انھوں نے کہا تھا کہ میں آپ سے ضرور ملوں۔"

پروفیسر عظمت علی نے سگار کا کش لیا، "میرے پاس آتے رہو بلکہ کالج کے علاوہ بھی تم جب چاہو میرے گھر آ سکتے ہو، میں سامنے ہی کریم آباد کے فلیٹوں میں رہتا ہوں۔"

"ضرور سر۔" وہ بولا، "مجھے آپ کی باتیں بہت پسند ہیں، سبق کی تشریح کرتے ہوئے آپ اس کا وہی مطلب نہیں بتاتے جو بظاہر سمجھ میں آتا ہے، آپ اس کا وہ مطلب بھی سمجھاتے ہیں جو اس کے اندر چھپا ہوتا ہے۔"



"بل میں چھپے سانپ کی طرح۔" پروفیسر عظمت علی ہنسے، "مگر یہ تو خطرے کی بات ہے، خیال رکھو کہیں تمھارا بستہ سانپوں سے نہ بھر جائے۔" مگر چار سال تک پروفیسر عظمت علی کا طالب علم رہنے اور ان سے ادب، سیاست، فلسفے اور معاشرتی رجحانات کے بارے آزادانہ بحث و مباحثہ کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ مختلف معاملات کے بارے میں اس کے دل و دماغ میں موجود سارے شبہات اور خدشات، واہمے اور تفکرات ہوا ہو گئے، گویا اس کا بستہ سانپوں سے بالکل خالی ہو گیا۔

کبھی کبھی جب پروفیسر عظمت علی اچھے موڈ میں ہوتے تو وہ اپنے شاگردوں کو اپنی کوئی کہانی یا کوئی مضمون بھی سناتے اور ان کی رائے سنتے۔ ناصر ان کی دعوت پر کبھی کبھار حلقۂ اربابِ ذوق کی نشست میں بھی چلا جاتا جہاں دنیا جہان کے موضوعات پر ادیبوں اور شاعروں کی گفتگو اسے حیران کر دیتی۔

بی اے کا نتیجہ آنے کے بعد جب ناصر پروفیسر عظمت علی سے ملنے گیا تو انھوں نے پوچھا کہ اب اس کا کیا ارادہ ہے۔

ناصر نے کہا، "یہی تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے سر۔ ابھی بہت سے ضروری کام کرنا باقی ہیں، ماں کا اصرار ہے کوئی بہتر نوکری تلاش کروں، بھائی کہتا ہے، آگے پڑھوں جب کہ بھابی اور بہن کا اصرار ہے کہ مزید وقت ضائع کیے بغیر شادی کر ڈالوں۔ گویا سب جھنجھٹ ختم۔"

"سب جھنجھٹ ختم یا سارے جھنجھٹ شروع؟" پروفیسر عظمت علی ہنسے، "شادی تو زندگی کے نئے جھنجھٹوں کی ابتدا ہے میرے بھائی! میرا خیال ہے تمھارے بھائی کی رائے سب سے اچھی ہے۔ ابھی اور پڑھو، کیوں نہ ایم اے کر ڈالو، انگریزی یا پھر اردو ادب میں، جو تمھارے لیے مناسب ہو۔"

"آپ کا مشورہ سر آنکھوں پر۔ مگر مجھے تو عمرانیات سے دلچسپی ہے۔" ناصر بولا، "بلکہ میں تو سندھی ادبیات پڑھنا چاہوں گا۔ سچل سرمست، شیخ ایاز، امداد حسینی، نیاز ہمایونی، عبدالکریم گدائی سب مجھے پسند ہیں اور شاہ لطیف سائیں، ان کا تو کہنا کیا:

سنو لطیف کی لے کو اس میں بھید ہے اس کے من کا
گن ہیں جس کے بول بول میں نینوں میں ہے نیہا

''اچھا ہاں، خوب یاد آیا، مجھے عمران نے کچھ بتایا تھا، داستانوں اور لوک کہانیوں سے تمھاری رغبت کے بارے میں— سنا تھا تم بھی اس کا کوئی کردار بننے کو بے تاب ہو، بات کہاں تک پہنچی؟'' پروفیسر عظمت علی نے کہا۔

ناصر جھینپ گیا، ''عمران بھائی تو مذاق کرتے ہیں۔ ایک دن میں ان سے کہہ رہا تھا کہ بھٹ شاہ چلیں گے عرس کے موقع پر— بس انھوں نے تو پوری داستان گھڑ ڈالی جس میں محبت کے سارے سُر ہیں۔''

''خیر، بھٹ شاہ کا پروگرام بناؤ تو بتانا۔'' پروفیسر عظمت علی بولے، ''میں بھی تم لوگوں کے ساتھ چلوں گا۔ بڑا جی چاہتا ہے اس خدا آشنا، صوفیِ برحق کے آستانے پر حاضری دینے کو، کہتے ہیں عرس کی رات ان کی داستانوں کے سب کردار ان کے مقبرے کے صحن میں بیٹھ کے لطیفی فقیروں کے گیت سنتے ہیں۔''

''سر آپ تو کہانی کار ہیں، تخیل کا بھرپور خزانہ ہے آپ کے پاس، کبھی کوئی کہانی ایسی بھی لکھیں جس میں داستانی علامتوں کی زبان میں ہمارے عہد کی کوئی تصویر پیش کی گئی ہو۔''

''ہاں کیوں نہیں۔'' پروفیسر عظمت علی نے کہا، ''ایک کہانی لکھی ہے میں نے، تم حلقۂ اربابِ ذوق کے جلسے میں آؤ نا اگلے اتوار کو۔ تعزیتی جلسہ ہے اور مجھے کہانی پڑھنی ہے۔''

''تعزیتی جلسے میں کہانی؟'' ناصر نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''اسے بھی تعزیتی کہانی سمجھو مگر وہ تمھاری سمجھ میں اسی وقت آئے گی جب تم اسے سننے کے لیے بالکل بچے بن جاؤ۔'' پروفیسر نے اس کا شانہ تھپتھپایا، ''دیکھو، آنا ضرور۔''

اور ناصر وہاں پہنچا۔ جلسے کی صدارت کوئی بہت ہی سینئر معزز ادیب کر رہے تھے۔ ایک صاحب نے بڑی غم انگیز نظم پڑھی۔ پھر پروفیسر عظمت علی کی باری آئی۔ ناصر نے دیکھا نشست کے سب حاضرین ہمہ تن گوش تھے۔ سب اشتیاق سے پروفیسر عظمت علی کو تک رہے تھے۔ سب بچے بن گئے تھے۔



# ۸

# تاش گھر

کہانی کا نام ''تاش گھر'' تھا۔ پروفیسر عظمت علی نے دھیرے دھیرے کہانی سنانا شروع کی۔

آؤ بچو کہانی سنو!

ایک تھا بادشاہ! ہمارا تمھارا خدا بادشاہ، خدا کا بنایا رسول بادشاہ!

بادشاہ جس گھر میں رہتا تھا اس کے چار حصے تھے۔

ان میں پھول والے رہتے تھے۔

اور چڑیا والے رہتے تھے۔

اور حکم والے رہتے تھے۔

اور اینٹ والے رہتے تھے۔

اینٹ والے سب سے غریب تھے اور ان کا کام محنت مزدوری کرنا اور بوجھ ڈھونا تھا۔ یہ سب کا بوجھ ڈھوتے تھے۔ چڑیا والے بیچ کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ لوگ لڑائی بھڑائی سے بھاگتے تھے کیوں کہ بوجہ بزدلی امن پسند تھے لیکن یہ بلند فضاؤں میں اُڑنا پسند کرتے تھے۔ پھول والوں میں وہ لوگ شامل تھے جن کے بدن سے عقل و حکمت کی خوش بو پھوٹتی

تھی اور وہ سارے گھر کو اپنی خوش بو سے مہکا دینا چاہتے تھے۔ رہ گئے حکم والے تو یہ وہ لوگ تھے جن کے یہاں حکم چلتا تھا اور جو حکم پر جان دیتے تھے۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ حکم چلائے بغیر گھر کے تحفظ کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

اور یہ کہانی تب سے شروع ہوتی ہے جب گھر میں حکم والوں کا حکم چلتا تھا۔ اسی زمانے کی بات ہے کہ یکا یک بڑے زور کا کال پڑا مگر بچو! یہ کال بھی عجیب تھا کہ اس میں کھانے کو تو ملتا تھا مگر کسی کے پاس سوچنے کو کوئی بات نہ رہ گئی تھی۔ خشک سالی اتنی تھی کہ خوشیوں کی برسات رُک گئی تھی اور اینٹ والے اور چڑیا والے اور پھول والے سب ٹکر ٹکر آسمان کو تکا کرتے۔ ابھی مسکراہٹوں کی خشک سالی دور نہ ہوئی تھی کہ اچانک سیلاب آیا، ایسا سیلاب کہ جس میں آدھا گھر ڈھ گیا اور تب گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ اینٹ والوں نے کہا کہ کچھ کرنا چاہیے۔ چڑیا والوں نے کہا یقیناً کچھ کرنا چاہیے۔ پھول والوں نے ہاتھ لہرائے، گھر کو بچانا ہے تو آگے بڑھو۔

پھول والوں میں ایک شہزادہ تھا، چندے آفتاب، چندے مہتاب۔ اس کی عقل و دانش کی بڑی دھوم تھی۔ جب آدھا گھر ڈھ گیا تو وہ آگے بڑھا اور اس نے گھر والوں سے کہا کہ اگر تم گھر کی بقا چاہتے ہو تو میرے پیچھے آؤ۔ پھر سب اس کے پیچھے چلے اور انھوں نے اس کے سر پر تاج رکھا۔ نئے بادشاہ نے سب گھر والوں کو اکٹھا کیا اور مقدس دن کی سنہری کتاب پر سب کے دستخط لیے کہ یہ گھر کی تعمیرِ نو کا عہد نامہ تھا۔

اب گھر کی تعمیر پھر سے شروع ہوئی۔ ڈھئی ہوئی دیواریں بننے لگیں اور پھول والوں کی خوش بو پھیلنے لگی۔ بادشاہ کہ نام اس کا حاتم طائی تھا، سبھوں کا ہم درد تھا لیکن اینٹ والوں سے اسے خاص نسبت تھی۔ وہ ان کے پاس گیا اور بولا کہ میں تمھارے سب سوال حل کروں گا۔ سو وہ ان کے سوالات کے جوابات ڈھونڈنے بستی بستی گھومتا پھرا۔ ایک بار وہ کوہِ قاف گیا اور پہاڑ کی ایک اونچی چوٹی پر بیٹھ کے اس نے ہمالہ دیوی کے ساتھ چوسر کھیلی۔ اس سے پیشتر نجانے کتنے ہی مہم جُو اس کے ساتھ بازی ہار کے اپنی جانوں کو گنوا چکے تھے۔ حاتم طائی بہت دانا تھا، اس نے دیوی کو اپنی باتوں سے ایسا رجھایا کہ بازی اس کے ہاتھ رہی۔ بچو!



حاتم طائی پہاڑ پر اس لیے گیا تھا کہ وہاں سے زور زور سے آوازیں آتی تھیں۔ یا اخی، یا اخی! دراصل پہاڑ سے پرے دشتِ ظلمات میں ہزاروں بندگانِ خدا جادو کے زور سے پتھر بنے تھے اور زبانِ حال سے مدد مدد پکارتے تھے۔ حاتم طائی نے ان مظلوم انسانوں کو دیونی لیلا سے رہائی دلائی جو اللہ کا شکر ادا کرتے بالآخر اپنے گھروں کو لوٹے۔

حاتم طائی نے سوال حل کرنے کے سلسلے میں چاروں کھونٹ کا سفر کیا اور دور دراز مقامات سے طرح طرح کی سوغات گھر والوں کے لیے لایا۔ چین، ایران و توران اور ملکِ عرب کے بادشاہ اس کے دوست بن گئے۔

حاتم طائی بہت سخی تھا۔ اینٹ والوں پر اس کی خاص عنایت تھی۔ اس نے ان کے لیے خزانے کا منہ کھول دیا اور اہلِ ہنر کو سونے چاندی میں تول دیا لیکن شاید یہی بات حاسدوں کو بری لگی اور وہ درپردہ بادشاہ کے خلاف سازشیں کرنے لگے مگر حاتم طائی کو اس کی زیادہ فکر نہ تھی۔ ایک تو اسے اپنی تلوار پر ناز تھا اور دوسرے اینٹ والے اس سے خوش تھے۔ وہ چپ چاپ اپنے کاموں میں لگا رہا۔

اسی زمانے میں ملکِ ظلمات سے سامری جادوگر کا ایلچی آیا اور اس نے یہاں کا اور ہی نقشہ پایا۔ وہ کہ اینٹ والوں کے بڑھتے ہوئے اثر کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور حاتم طائی کی اس خودسری سے نالاں تھا کہ وہ اوروں کی مدد کے بغیر ہی سارے سوالات حل کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اس صورتِ حال سے وہ بہت رنجیدہ ہوا۔ پھر اس نے خداوند سامری کا نعرہ لگایا اور سر پر سلیمانی ٹوپی رکھ کے غائب ہوگیا اور گھر کے چاروں کونوں میں سحر پھونکتا پھرا۔

حاتم طائی کو گھر کا نظام چلاتے کئی سال ہوگئے تھے لیکن ابھی بہت سے سوالوں کے جواب اسے ڈھونڈنے تھے مگر اب کبھی کبھی اسے یہ سرگوشیاں سنائی دینے لگی تھیں کہ حاتم طائی بوڑھا ہوگیا ہے، اسے چاہیے کہ وہ آنے والے موسمِ بہار میں پھولوں کی نمائش منعقد کرے اور پھول والوں میں سے جس کے پاس سب سے اچھے پھول ہوں، اس کے حق میں دست بردار ہوجائے۔ کچھ دن حاتم طائی اس مسئلے پر غور کرتا رہا لیکن پھر اس نے سوچا کہ جب اینٹ والے اس کے ساتھ ہیں تو اسے اپنے پھولوں کو اس نمائش میں ضرور شامل کرنا چاہیے۔

سو، جب موسمِ بہار آیا اور پیڑوں پر رونق آنے لگی تو پھولوں کی ملک گیر نمائش منعقد کی گئی۔ ہر طرف پھول ہی پھول تھے۔ دروازوں اور دیواروں پر، راستوں میں، چھتوں پر، لوگوں کے ہاتھوں میں۔ اینٹ والے، چڑیا والے اور پھول والے سب اس نمائش میں موجود تھے۔ حکم والے بھی اس نمائش کو سجتے دیکھ رہے تھے۔ پھول والے طرح طرح کے پھول نمائش میں لائے تھے۔ حاتم طائی کے پھول سرخ تھے اور ان سے ہر طرف روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ کچھ پھول والوں نے سفید گلاب نمائش میں رکھا تھا جو ہرے ہرے پتوں میں بڑا خوب صورت لگ رہا تھا۔ پھولوں کے بارے میں سب نے اپنی اپنی رائے کا اظہار کیا۔

اینٹ والوں نے اپنی رائے دی۔ چڑیا والوں نے اپنی رائے دی۔ پھول والوں نے اپنی، حکم والوں نے بھی اپنی پسند کا اظہار کیا۔ حاتم طائی کے گلاب جن میں سرخ، سبز اور سیاہ پنکھڑیاں تھیں، بہت پسند کیے گئے لیکن یہ بات اونچی سلیمانی ٹوپی والے کو اچھی نہ لگی جن کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پھولوں سے گھر میں آگ لگ گئی۔ سرخ گلاب انگاروں سے بھر گئے اور سفید گلابوں سے آنچ اٹھنے لگی۔ گھر جلنے لگا اور چھتیں گرنے لگیں۔ اینٹ والوں کو تتر بتر کر دیا گیا۔ چڑیا والے زد و کوب کیے گئے اور پھول والوں کو اذیتیں دی گئیں۔ جادوگر کی پھونکوں سے آندھی آئی اور گھپ اندھیرا چھا گیا۔

پھر اچانک اندھیرے سے حکم والے سامنے آئے اور انھوں نے للکار کے کہا، ”اب گھر میں اینٹ والے ہیں، نہ چڑیا والے اور نہ پھول والے کیوں کہ جب حکم کو ترپ کا مرتبہ حاصل ہو تو صرف حکم باقی رہ جاتا ہے۔“

اور پھر یہی ہوا کہ گھر میں پھولوں کی خوش بو پھیلتے پھیلتے اچانک غائب ہو گئی اور اینٹ والوں اور چڑیا والوں اور پھول والوں کی شناخت جاتی رہی۔ اب ان میں کوئی عزت مآب اِکّا تھا، نہ کوئی خادمِ خاص، سرکارِ عالی کا ظہور تھا نہ ملکۂ عالیہ کی جلوہ فرمائی — اب ان کے سارے اکّے، پنجے، چھکّے، نہلے اور دہلے بے اثر ہو گئے تھے۔ جب بادشاہ نہ رہا تو گھر میں سب جوکر ہی قرار پائے کیوں کہ اب حکم والوں کا دور دورہ تھا۔ اور بچو! پھول والوں کا بادشاہ جس کے ہاتھوں مارا گیا، وہ حکم کا غلام تھا۔



گھر کی دیواروں پر لکھا ہے کہ کبھی یہاں اینٹ والے اور چڑیا والے اور پھول والے رہتے تھے لیکن اب — غور سے سنو تو سفید مستطیل پہاڑ سے یہی آواز آتی ہے کہ یا اخی، یا اخی! اور پھر کچھ صدائیں ابھرتی ہیں کہ ایک بار دیکھا ہے دوسری بار دیکھنے کی ہوس ہے۔ لیکن بچو! اب یہاں کوئی حاتم طائی تھوڑا ہی ہے جو اس سوال کو حل کرے، ارے کیا سو گئے بچو — سنو!“

اور ناصر نے دیکھا، بچے سوئے نہیں تھے، وہ ایسے دم بخود بیٹھے تھے جیسے انھیں کسی آسیب نے جکڑ لیا ہو۔ پروفیسر عظمت علی کا افسانہ ان کے کانوں سے کسی سانپ کی طرح ان کے اندر اترا اور ان کے وجود کے اندر کنڈلی مار کے بیٹھ گیا۔



# ۹

# سلطان البحر

اس صبح ناصر کی آنکھ کھلی تو اسے کھڑکی میں سے کارخانے میں نئی خوب صورت کشتی راج ہنس کی طرح اپنا سر اٹھائے سمندر کو تکتی نظر آئی۔ سورج کی کرنوں میں اس کا سراپا بڑا چمک رہا تھا۔ ناصر کو یاد آیا، اس دن وہاں ملک کی سب سے بڑی تجارتی کشتی کو تکمیل کے بعد سمندر میں اتارا جانے والا تھا۔ ابوعبید نے اس کشتی کا نام 'سلطان البحر' رکھا تھا اور وہ اس کی تکمیل کو اپنے خواب کی تعبیر سمجھتا تھا کیوں کہ اس کے خیال میں آبنائے ہرمز سے لے کر خلیجِ عدن اور مشرقی افریقا کے ساحل تک عربی طرز کی اس سے بڑی چوبی کشتی آج تک نہیں بنی تھی۔

ناصر کو کارخانے میں کام کرتے ہوئے سال بھر ہو چکا تھا اور اسے پتا تھا کہ ابوعبید کے لیے اس کشتی کی کتنی اہمیت تھی۔ اس نے تو اپنا خواب پورا کرنے کے لیے مہینوں سے خود پر راتوں کی نیندیں حرام کر لی تھیں۔

ناصر کو گودام کا نگراں ہونے کی وجہ سے معلوم تھا کہ ۱۸۰ فٹ لمبی، ۲۳ فٹ اونچی اور ۴۵ فٹ چوڑی اس تجارتی کشتی پر کتنی لاگت آئی تھی۔ اس کی تعمیر میں چالیس ہزار ٹن لکڑی صرف ہوئی تھی۔ کشتی کا پورا ڈھانچا بلوا نامی لکڑی سے تیار کیا گیا تھا جو ملائیشیا سے منگائی گئی تھی اور اس کے پہلوؤں کی محرابیں شیشم سے بنی تھیں جو پاکستان سے آئی تھیں۔





ابوعبید کو یقین تھا کہ 'سلطان البحر' کے ذریعے ہر پھیرے میں نو سو ٹن سے زیادہ تجارتی سامان جنوبی ایشیائی اور مشرقی افریقا کی بندرگاہوں تک لے جایا جاسکے گا۔ کشتی کے پورے ڈھانچے کو سرخ اور سبز رنگ سے رنگا گیا تھا۔ اس پر ۱۵۰۰ ہارس پاور کے تین انجن نصب تھے جب کہ علاحدہ سے بادبانوں کا بھی انتظام موجود تھا۔

'سلطان البحر' کو سمندر میں اتارنے کی تقریب میں شہر کے تمام معززین کو بلایا گیا تھا۔ تقریب کے دوران وہاں ناصر کو سب سے زیادہ خوشی سند باد جہازی کو دیکھ کر ہوئی۔ اس نے بھی ناصر کو فوراً پہچان لیا۔ "آہا، برادر ناصر!" اس نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا، "خوش تو ہو نا؟ ملاحوں اور کشتی سازوں کی صحبت میں رہتے رہتے تنگ تو نہیں آ گئے؟" اس نے پوچھا۔

"نہیں، بالکل نہیں، ابوعبید تو مجھ پر بہت مہربان ہے اور میں نے یہاں آ کے بہت کچھ سیکھا ہے، خاص طور پر کشتیوں کے بارے میں، اب میں بتا سکتا ہوں کہ کشتی اور کشتی میں کیا فرق ہوتا ہے؟"

"ہا ہا—" سند باد نے خالص ملاحوں والا قہقہہ لگایا، "اچھا میں کشتیوں کے بارے میں تمھارے علم کا امتحان لوں گا، کسی دن آؤں گا ابوعبید کے دیوان خانے میں سب سے ملنے اور اپنے پچھلے سفر کی رُوداد سنانے۔"

'سلطان البحر' کو سمندر میں اتارتے وقت فضا میں عربی آرکسٹرا کی دھنیں گونجیں اور ڈھول، دف اور رباب بجانے والوں کی سنگت میں مقامی گلوکار اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہے۔ عربی دوشیزاؤں نے اپنے بال ہلا ہلا کے اور سفید کنتوروں میں ملبوس ہر عمر کے مردوں نے بید کی چھڑیاں لہرا لہرا کے بڑی دیر تک رقص کیا۔

اسی رات عشا کی نماز کے بعد ابوعبید کے دیوان خانے میں سب جمع تھے اور اسے 'سلطان البحر' کے منصوبے کے مکمل ہونے کی مبارک باد دے رہے تھے۔

ابوعبید نے کہا، "جب میں چھوٹا تھا اور اپنے بابا کے ساتھ اپنے گھرانے کی چھوٹی کشتی میں عمان کے ساحلی شہروں یا ایران کی بندرگاہوں کی طرف جاتا تو سمندر کی نامہربان ساعتوں میں اسے طوفانی لہروں سے لڑتے اور تیز ہوا کے تھپیڑوں سے راستہ بھولتے دیکھ کر

بڑا دل گھبراتا تھا۔ میں نے اسی وقت یہ ارادہ کرلیا تھا، میں بڑا ہوکر ایسی مضبوط اور ثابت قدم کشتیاں بناؤں گا جو مچھیروں، موتی بھرے سیپوں کے شکاریوں، تاجروں اور دور دراز سمندری بستیوں کا رُخ کرنے والے مسافروں کی توقعات پر پوری اتریں گی۔"

ابوعبید کے دیوان خانے میں اب روز ہی محفلیں جمنے لگیں جن میں ناصر کو سند باد کے علاوہ کچھ اور بھی نئے چہرے نظر آئے۔ ان میں پپی سنگھ بادل، فریدون خستہ تن اور ثابت خان شامل تھے۔ پپی سنگھ بادل ایک ٹریلر ڈرائیور تھا جو اپنے میل بھر لمبے ٹریلر میں کشتیاں، لکڑی کے کیبن اور لوہے کے جناتی کنٹینر لاد کے دور دراز بستیوں تک لے جاتا۔ فریدون خستہ تن ایک ایرانی نژاد دکان دار تھا جس کے یہاں عطریات، خشک میوہ جات، زعفران اور کیویئر کے ذخیرے دستیاب تھے۔ ثابت خان کا تعلق پاکستان کی وادیِ سوات سے تھا اور وہ یہاں برسوں سے ٹیکسی چلا رہا تھا۔ سند باد جہازی سے اس کی پرانی دوستی تھی، اس لیے جب سند باد اپنی سمندری مہمات سے واپس آتا، ثابت خان ہر وقت اس کے ساتھ رہتا۔

"ہاں تو 'سلطان البحر' کا پہلا سفر کدھر کا ہوگا؟" سند باد نے پوچھا، "شط العرب کی بندرگاہوں کی طرف یا پھر مالابار، عدن اور زنجبار کی طرف؟"

"سلطان البحر، میری جہازی کمپنی کا فلیگ شپ ہوگا۔" ابوعبید نے جواب دیا، "اپنے پہلے سفر میں یہ پرانی کاریں لے کر ممباسا جائے گا۔"

"نئے جہاز پر پرانی گاڑیاں— کیا بدمذاقی ہے۔" سند باد بڑبڑایا، 'سلطان البحر' کو تمھیں کسی اور کمپنی کے سپرد کرنا چاہیے تھا ابوعبید! اگر کہیں میں اس کا مالک ہوتا تو میں اسے کسی نئی دنیا کے سفر پر لے جاتا، کسی نئے براعظم کی دریافت کے لیے— میری آنکھیں عرصے سے پرانے ساحل اور پرانے چہرے دیکھ دیکھ کے تھک گئی ہیں یارا!"

ابوعبید ہنسا، "میں تجھے خوب جانتا ہوں سند باد، تیری جہازی مہمات اب کیا ہوتی ہیں؟"

"میں سمجھ گیا تو کیا کہنا چاہتا ہے ابوعبید، یہی نا کہ کشتیاں میری کم زوری ہیں، ہاں ہیں میری کم زوری، اصل میں ہر کشتی مجھے صنفِ نازک کی طرح خوش ادا اور خوش اطوار لگتی ہے۔ زندہ اور سانس لیتی ہوئی۔" سند باد بولا، "حالاں کہ تو کشتی ساز ہے، کشتیاں تراشتا ہے



مگر میخوں سے تختوں پر تختے ٹھونک کے تو سمجھتا ہے کہ تو نے انسانوں کے لیے ایک بے جان سی سواری بنا دی ہے مگر تجھے کیا پتا ابوعبید، ہر کشتی جان دار ہوتی ہے، اس میں حس ہوتی ہے، خوش ہونے اور خفا ہونے کی حس— جب ان پر غلاظت لادی جاتی ہے تو وہ خوش نہیں ہوتیں۔ اسی لیے کہتا ہوں بھائی کہ 'سلطان البحر' کو پرانی گاڑیوں کا گودام مت بناؤ!"

"اے مجنون شخص—!" ابوعبید ہنسا، "مجھے ثابت خان سے پوچھنا پڑے گا کہ یہاں آنے سے پہلے وہ تجھے کہاں لے گیا تھا، اس ساحلی شیشہ خانے میں تو نہیں جو عجمان کے ایک گوشے میں ملاحوں کو مدہوش کرنے کے کام آتا ہے۔"

سند باد نے کہا، "ہاں میں بھی جاتا ہوں وہاں، دو ایک جرعے پی کے تازہ دم ہونے، مگر بخدا آج نہیں گیا، کشتیوں کی بات تو میرے دل کی بات ہے، سب کشتیاں مجھے ایسی لگتی ہیں کہ ان سے پیار کرنے کو جی چاہتا ہے۔"

"عجب منطق ہے تمھاری، میرے دوست— ابوعبید نے کہا، مگر سب کشتیاں ایک جیسی تو نہیں ہوتیں، کوئی بڑی ہوتی ہے کوئی چھوٹی، کوئی کسی کام کی ہوتی ہے اور کوئی کسی کام کی!"

"عورتیں کب ایک جیسی ہوتی ہیں—" سند باد نے جواب دیا، "میں بتا سکتا ہوں، بوم بڑی ہوتی ہے جیسے تمھاری بنائی ہوئی کشتیاں، موٹی گھریلو عورتوں کی طرح جو ٹوکری ہاتھ میں لیے بازار میں گھر کی خریداری کرتی پھرتی ہیں لیکن اور بھی تو ہیں جیسے سَم بک، ڈنگی، بدان، گنجا، بغلا، کوتیا، بالم، جلبوت، زمروک، مرکب، خاطرہ، ہوری اور ہیکل— ان میں کچھ بھرے بھرے بادبانی بدن والی ہیں، کچھ دبلی پتلی اور چھریری، نازک سی جنھیں حرکت میں لانے کے لیے ہلکا سا پتوار ہی کافی ہے— ان سمندری دوشیزاؤں نے ہر زمانے اور ہر علاقے میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنایا ہے— اور میں تو ٹھہرا جہازی— ہمیشہ ان کے بادبانوں اور مستولوں سے لپٹ کے سونے والا— میں ان کے گیت نہ گاؤں تو کیا کروں، مجھے تو مالابار کے علاقے کی سانپ کشتیاں بھی اچھی لگتی ہیں، چپوؤں کے زور پر اٹھلا اٹھلا کے پانی پر چلتی ہوئی—!" اس نے سامنے رکھی ٹوکری میں سے ایک رسیلی کھجور اٹھا کے منہ میں رکھی۔

ناصر بڑی دیر سے اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ اس نے کبھی کسی کشتی کو اس نظر

سے نہ دیکھا تھا۔

''آپ کے خیال میں کشتیاں خوش بھی ہوتی ہیں اور خفا بھی — یہ کیسے؟'' ناصر نے پوچھا۔

سندباد نے جواب دیا، ''خوش گوار موسم، نرم ہوا اور ہلکی بارش میں کشتیاں خوش رہتی ہیں لیکن تیز ہواؤں، خراب موسم اور طوفانی بارش میں ان کا پارہ چڑھ جاتا ہے، پھر وہ وہی کرتی ہیں جو ناراض عورتیں کرتی ہیں، چیخ پکار، چیزوں کی اٹھا پٹک، ہنگامہ ہی ہنگامہ۔ پھر جب کوئی کشتی سفر کے دوران زیادہ ہی آپے سے باہر ہونے لگے تو پھر اس کے ساتھ سفر کرنے کو جی نہیں چاہتا — طلاق دینے کا خیال دل میں آتا ہے!''

''تمھارے نکاح میں کتنی کشتیاں آئی ہیں اب تک؟'' ابوعبید نے شرارت سے ایک آنکھ میچ کے انوکھا سوال کیا۔

سندباد ہنسا، ''میں تمھاری طرح گنتی نہیں کرتا — اور نکاح کے لیے تو ویسے بھی چار کی قید ہے، اس لیے نکاح بھی نہیں کرتا، خاصا برباد شدہ ہوں!''

ناصر سمجھ گیا کہ اب وہ کسی اور ہی موضوع پر طبع آزمائی کر رہا ہے، لہٰذا اس نے بات کا رُخ موڑنے کے لیے بظاہر ایک غیر متعلق سا سوال داغا، ''آپ نے اتنے بہت سارے سمندری سفر کیے ہیں، دور دور گئے ہیں، نئے نئے سمندر اور نئی نئی بندرگاہیں دیکھی ہیں، طرح طرح کے لوگوں سے ملے ہیں، کبھی آپ کے ساتھ کوئی خوف ناک واقعہ پیش آیا؟ کہیں کسی خوف ناک سمندری بلا یا کسی پہاڑ کے غار سے باہر جھانکتے کسی یک چشم یا سہ چشم دیو سے سابقہ پڑا؟''

سندباد کچھ دیر سوچتا رہا، پھر بولا، ''سنا ہے کہ کھلے سمندروں میں ایک ہول ناک عفریت رہتا ہے، مارِد کہتے ہیں اسے اور اس کا کام سمندروں میں راہ چلتے سفینوں کو غرق کرنا ہے مگر مجھے تو وہ کہیں نظر نہیں آیا۔ خطرناک ترین طوفانوں میں بھی جب بارش کے دیوتا سرکش ہوا کے کوڑے ہاتھ میں لیے سمندری جہازوں اور سفینوں کو تباہی کی طرف ہنکاتے ہیں، میں اس کی گرفت سے بچا رہا۔''

ابوعبید نے کہا، ''مشہور ہے کہ خلیجی سمندر میں بھی ایک غ۔ ہ ور اور حاسدہ جنّی رہتی



۔ہو جو ہتھے چڑھ جانے والے عشق پیشہ ملاحوں کو درمیان سے چیر ڈالتی ہے، ذرا اس سے بچ کے رہنا۔''

سندباد مسکرایا، ''اگر وہ جنّی ہے تو مجھے اس سے مل کے خوشی ہوگی، عورت چاہے کسی ۔ل میں ہو، مجھے قبول ہے۔''



۱۰

# سُر بھٹائی

ساز کی جھنکار اس کے لیے تلوار بن گئی اور سخی راجا رائے ڈیاچ نے اپنا سر اُسے دان دے دیا جو راگ میں عشق کی آگ جلا سکتا تھا۔ اس نے چنگ میں گھنگھرو باندھے تھے اور تُمے کے پھول——

یہ بیجل تھا، بے درد انسان اور بے مثل مغنی جس کے ساز سے سرمدی نغمے پھوٹتے تھے اور یہ عرس کی شام تھی، بھٹ شاہ میں—— اور ''شاہ جو رسالو'' کے سارے سُر اور ساری داستانیں مجسم ہوگئی تھیں۔ ثقافتی مرکز میں شاہ کی داستانوں پر مبنی ٹیبلو پیش کیے جا رہے تھے۔ سازندوں، موسیقاروں اور گلوکاروں نے سُروں اور دُھنوں کا دھمال ڈال رکھا تھا۔

صحن میں لطیفی فقیر ناچ ناچ کے اِکتارے، رباب اور الغوزے بجا رہے تھے۔ اندر ضریح خاص پر گلابوں کے فانوس روشن تھے۔ اس سے متصل برآمدے میں شیشے کی الماریوں کے اندر مقدس مزاروں، مقبروں اور ضریحوں کی شبیہیں تھیں۔ زائرین پانچ محرابوں والے برآمدے میں دعائیں پڑھتے ایک در سے نکلتے اور دوسرے در میں چلے جاتے۔

مزار کا گنبد برقی قمقموں سے جگمگا رہا تھا اور اطراف میں سُروں کے گلستان کھلے تھے۔ ہر کوئی گا رہا تھا اور تھرکتے قدموں سے اپنے وجود کی گہرائیاں ناپ رہا تھا۔ کالی عباؤں اور





[illegible] رنگ کے عنابی اور کالے پھولوں والی چادروں میں دمکتے چہرے، روشن آنکھیں، دعاؤں [illegible] ہونٹ—— شاید یہ سب صورتیں شاہ کی کتابِ عشق میں سے برآمد ہوئی تھیں۔

صحن میں لطیفی فقیروں نے بھٹائی کے نغموں، بیتوں اور وائیوں کے نئے دور کا آغاز کیا تو پروفیسر عظمت علی بے قرار ہو کے ان کے جھرمٹ میں جا بیٹھا۔ رات گزر گئی اور آخری ستارے کے اوجھل ہونے سے پہلے جب آسمان پر فرشتوں نے صبح کے موقلم سے سفید حرفوں میں اللہ کا اسمِ اعظم تحریر کیا تو فضا میں سرمدی صدائیں ابھرنے لگیں:

تیری ہی ذات اوّل و آخر[1]
تو ہی قائم ہے تو ہی قدیم
والیِ شش جہات، واحد ذات
رازقِ کائنات، ربِ رحیم

پھر موسیقاروں نے سُر پربھاتی میں ایسا راگ الاپنا شروع کیا جسے بس روح سن سکتی تھی اور روح سنا سکتی تھی:

نیند میں بیتی جا رہی ہے رات[2]
اے مغنی کھلی ہے راہِ نجات
ماہ و انجم لٹا رہا ہے کوئی
نہ رہا کوئی صاحبِ حاجات
وہ کھلا ہے خزینۂ فطرت
موتیوں سے بھرے ہیں سب کے ہات

پروفیسر عظمت علی اس رات کے سحر کو کبھی نہیں بھولا۔ پھر ایک دن جب ناصر اور عمران دونوں اس کے کتب خانے میں موجود تھے، اس نے اچانک سوال کیا، ''تم نے اس رات شاہ کے عرس میں دیکھا، وہ سب وہاں موجود تھیں، شاہ کی سب محبوبائیں—— سسی، ماروی، مومل، نوری، سورٹھ، لیلا اور سوہنی—— میں نے سب کو وہاں آتے اور مرشد کے مرقد پر ادب سے سر

۱۔ سُر کلیان (شاہ جو رسالو، ترجمہ شیخ ایاز)
۲۔ سُر پربھاتی

جھکاتے دیکھا۔"

"ارے ــــ!" عمران حیران ہو کے بولا، "کیا کہہ رہے ہیں آپ؟"

"میں سچ کہہ رہا ہوں۔" پروفیسر عظمت علی کی آنکھوں میں بڑی پُراسرار چمک ابھری۔

"میں نے تو ان سب کو اپنے آس پاس ہی پایا۔ جب فقیر گا رہے تھے تو وہ ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہی تھیں، ان کے سازوں اور ان کے والہانہ رقص کو ــــ میں نے دیکھا ان کی آنکھوں میں تارے تھے اور ان کی پیشانیاں ایک اَن جانے سرور سے دمک رہی تھیں۔"

ناصر اور عمران دم بخود بیٹھے تھے۔ پروفیسر عظمت علی نے پھر کہنا شروع کیا، "فقیر گاتے رہے اور سازوں کی زبان میں وائیاں اور داستانیں سناتے رہے اور شاہ کے پرستانِ سخن کی ساری پریاں آس پاس ناچتی رہیں۔ پھر اس کے بعد سازوں کی دھنیں بے حد اونچی ہوگئیں اور فقیروں کا رقص اور تیز ہوگیا۔ آوازیں آوازوں میں اور چہرے چہروں میں گڈمڈ ہوگئے اور چاروں طرف حق ہے، حق ہے کی صدائیں گونجنے لگیں۔ میں بے خودی کے عالم میں وہیں بیٹھا رہا مگر پھر نہ جانے میں نیند میں تھا یا بیدار تھا، مدہوش تھا یا باہوش تھا، مجھے کچھ پتا نہیں، بس اتنا یاد ہے کہ میں مزارِ اقدس سے نکلا اور عجیب راستوں پر چلا۔"

"کیسے عجیب راستے؟" عمران نے سوال کیا۔

"کیا بتاؤں۔" پروفیسر عظمت علی نے کھوئے کھوئے سے لہجے میں بات آگے بڑھائی، "میں نے خود کو کبھی صحرا، کبھی دریا اور کبھی گھنے جنگل میں پایا، وہاں سے آگے بڑھا تو کبھی بادشاہوں کے محل میری راہ میں آئے تو کبھی فقیروں کے جھونپڑے۔ میں نے ماروی کو اپنوں سے بچھڑنے کا ماتم کرتے اور سسی کو صحرا میں پنھوں کی تلاش میں اپنے پاؤں کے آبلوں سے راستوں میں چراغ روشن کرتے اور سوہنی کو اپنے محبوب کی یاد میں اپنے ٹوٹے ہوئے گھڑے میں آنسوؤں کا طوفان اٹھاتے دیکھا اور اس سارے وقت میں ایک صدا تھی جو مسلسل زمین و آسمان سے ابھر رہی تھی:

کہاں رہیں گے تجھ بن ساجن یہ دکھیارے نین☆۱

تو ہی پالنہار ہے ان کا، تجھ سے ہے سکھ چین

☆۱۔ سُر آسا وائی (شاہ جو رسالو، ترجمہ شیخ ایاز)



مجھے اب تک سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ گیت کون گا رہا تھا۔ یہ ان برہنوں کے دل کی آواز تھی جو صحرا اور دریا کے دکھ جھیل رہی تھیں یا پھر مرشد خود اپنی ان چاہنے والیوں کے روپ میں اپنے محبوب کے دیدار کا تمنائی تھا۔"

پروفیسر عظمت علی یہ کہہ کر کچھ دیر کو چپ ہوگیا اور پھر ناصر اور عمران کو ہمہ تن گوش دیکھ کر کہا، "وہ رات تو میرے لیے اندر کے سفر کا وسیلہ بن گئی ــــ شاید وہ سب ایک خواب تھا [illegible]لاف کا ایک لمحہ ــــ اگر میں سو رہا تھا تو پھر اس رات میں ہمیشہ کے لیے جاگ اٹھا اور اگر یہ سب کچھ میں نے جاگتے میں دیکھا تو پھر سونے کی خواہش باقی نہیں رہی۔"

اب عمران مسکرایا اور اس نے کہا، "اوہو! آج پتا چلا کہ آپ ہم لوگوں کی طرح مٹی سے نہیں بنے، آگ سے بھی نہیں بنے اور اگر پانی سے بنے ہوتے تو اب تک اوروں کی پیاس بجھاتے بجھاتے پورے کے پورے بہہ گئے ہوتے۔ میرا خیال ہے کہ آپ صرف ہوا سے بنے ہیں، جبھی تو آپ اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے کہیں بھی پہنچ جاتے ہیں، سب کچھ دیکھ لیتے ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ عرس کے میلے میں ہم بھی موجود تھے مگر ہم نے ملاکھڑے میں زور آزمائی کرتے شہ زوروں اور مقبرے کے پچھواڑے سجے بازار میں خریداری کرتے ہوئے [illegible]ب روؤں کے علاوہ اور کچھ نہیں دیکھا اور یہ اپنے اپنے ظرف کی بات ہے، اس میں شاہ سائیں کا کیا دوش۔"

ناصر نے کہا، "ایک بات البتہ ہمیں فقیروں کے گائے ہوئے ابیات سے سمجھ میں آئی کہ شاہ صاحب نے ظالموں اور لٹیروں کی ہمیشہ مذمت کی۔ انھوں نے بستی میں ہنگامہ برپا کرتے ڈاکوؤں اور دریا میں معصوم لوگوں کو ہڑپ کر جانے والے مگرمچھوں کو قابلِ نفرت بتایا ہے۔"

"واقعی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ شاہ سائیں کو مستقبل کی بھی خبر تھی۔" عمران بولا، "آنے والے وقت کا کیسا نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے، اپنے اس شعر میں، کہتے ہیں:

ان لٹیروں کی چیرہ دستی سے

دور آہ و فغاں کا آبا ہے"

"لگتا ہے کہ آج کا شعر ہے۔" وہ بولا۔

پروفیسر عظمت علی نے کہا، ''مجھے خوشی ہوئی کہ تم لوگوں نے بھی کچھ نہ کچھ وہاں سے حاصل کیا۔'' عمران نے ہنس کے کہا، ''ناصر کو تو اور بہت کچھ ملا ہے اس در سے — وہ جو نوری ہے شاہ سائیں کی ایک پری — ناصر اس کی تلاش میں اب دادو ضلعے کے ایک گوٹھ میں جانا چاہتا ہے، سائیں راول کی تلاش میں۔''

O

## ۱۱

# الف لیلہ تھیٹر

ناصر کچھ دیر پہلے ہی کارخانے سے لوٹا تھا اور غسل خانے میں منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ نائر نے دروازہ کھٹکھٹایا — وہ باہر نکلا تو دیکھا اس کے ساتھ ثابت خاں ڈرائیور کھڑا تھا۔

''آہا، خان صاحب آپ؟'' ناصر نے خوش دلی سے کہا، ''کیسے آنا ہوا، خیر تو ہے؟''

ثابت خان بولا، ''خیر کہاں، آج کل سند باد کا ساتھ ہے، اسی کے ساتھ بندھا پھرتا ہوں، اس وقت وہ باہر گاڑی میں موجود ہے اور آپ کو بلا رہا ہے۔ کہتا ہے آپ کو ساتھ لے کر کہیں جانا ہے۔''

''مجھے —؟'' ناصر حیران ہوا، ''سند باد مجھے ساتھ لے کر کہاں جانا چاہتا ہے۔ خیر دوست آدمی ہے، میں چلتا ہوں تمھارے ساتھ۔''

وہ ثابت خان کے ساتھ کشتیوں کے کارخانے سے باہر نکلا تو دیکھا کہ لمبی سی مرسڈیز میں سند باد جہازی پچھلی سیٹ پر نیم دراز تقریباً سویا ہوا ہے۔

ناصر نے قریب پہنچ کے ذرا زور سے سلام داغا، سند باد نے پہلے ایک آنکھ کھولی اور داڑھی کی اوٹ میں مسکرایا، پھر دوسری بھی کھولی اور بولا، ''آؤ شہزادے، ذرا سیر کو چلتے ہیں، تمھارا اس کشتیوں کے قبرستان سے دل نہیں گھبراتا کیا؟''

ناصر نے کہا، ''آپ کو تو کشتیاں بہت محبوب ہیں، آپ کیسے ایسی کشتی دشمنی کی بات کر سکتے ہیں؟''

''مردہ اور بے جان کشتیوں سے مجھے کوئی دل چسپی نہیں۔'' وہ بولا، ''چلو ذرا کچھ پھڑکتے ہوئے جان دار سفینوں کا نظارہ کرتے ہیں۔''

ناصر، ثابت خان کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گیا اور گاڑی چل پڑی۔

کار چلی تو شہر کی سڑکیں، گلیاں اور بازار اس کے پہیوں کے نیچے سے پھسلتے گئے۔

ناصر اتنے دنوں سے اس ساحلی شہر میں مکین تھا مگر بہت سی جگہیں اس نے اب تک نہیں دیکھی تھیں۔ پرانا بستکیہ کا محلّہ جس میں چوکور بادکشوں سے سجے ہوئے پرانے مکان تھے۔ شیخ سعید کا گھر، کچا قلعہ جس کے آگے دو توپیں سجی تھیں، پتلی گلیاں — شارع علی ابنِ ابی طالب کے دونوں سروں پر دو مسجدیں جن کے عکس کھاڑی کے پانی میں ہلکورے کھاتے رہتے۔ ثقافتی قریے کے سرھانے کھاڑی پر قدیم عبرے — نئی سڑکیں، نئے پل، نئے ساحل — اور پھر شیشے کی ایک فلک بوس عمارت۔

''ہاں بس یہیں روکنا۔'' سندباد نے ثابت خان سے کہا۔ سندباد کار سے اترا۔ ناصر بھی باہر آ گیا۔ سندباد نے کہا، ''آؤ اندر چلتے ہیں۔''

مرمریں سیڑھیوں کے اوپر شیشے کے دروازے تھے۔ سندباد نے گھومنے والے شیشے کے دروازے کو حرکت دی، کھل جا سم سم — اور دروازے نے ان کے لیے اپنی بانہیں پھیلا دیں۔

اندر خوب صورت جگمگاتی ہوئی دکانیں تھیں۔ بے شمار زرق برق لوگ ان میں خریداری کرتے نظر آئے۔ سندباد ناصر کے ساتھ روشن راہ داریوں اور جگمگاتے بازاروں سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا گیا۔ ''خوب صورت شاپنگ مال ہے یہ۔'' ناصر بولا۔

''میں تمھیں یہاں اپنے کچھ دوستوں سے ملانے لایا ہوں۔'' سندباد نے کہا۔

''کہاں ہیں وہ؟'' ناصر نے پوچھا۔

''وہ یہیں الف لیلہ تھیٹر میں ملیں گے۔'' سندباد نے جواب دیا۔

''کون سا تھیٹر؟'' ناصر حیران ہوا۔



''الف لیلہ تھیٹر!'' سندباد نے کہا، ''اس میں نوجوان ڈرامے اسٹیج کرتے ہیں۔''

پھر ایک روشن راہ داری سے مڑتے ہی انھیں سامنے ایک دیوار پر ''الف لیلہ تھیٹر'' کا جھلملاتا ہوا برقیاتی بورڈ نظر آیا۔ سندباد نے گیٹ پر تعینات محافظ سے کہا کہ وہ تھیٹر کی کینٹین میں جانا چاہتے ہیں۔ ''ضرور!'' محافظ نے ایک طرف ہٹ کے انھیں اندر جانے کا راستہ دیا۔ کینٹین میں گول میزوں کے گرد بہت سے لڑکے اور لڑکیاں بیٹھے تھے۔ بہت سے آرٹسٹ اس وقت بھی میک اپ میں تھے جیسے ابھی اسٹیج پر جانے والے ہوں یا ڈراما ختم ہونے کے بعد باہر آ گئے ہوں۔ سگریٹوں، سگاروں اور شیشے یعنی عربی حقے کے رسیا اپنے سروں پر دھوئیں کے مرغولے اڑا رہے تھے اور فضا میں فلافل، شاورمے اور کافی کی مہک رچی بسی تھی۔

ناصر نے دیکھا۔ ایک بہت بڑی میز کے گرد چالیس چوروں کا ٹولہ بیٹھا تھا اور مرجینا خنجر سے علی بابا کے سامنے رکھا تین منزلہ کیک کاٹ رہی تھی۔

''آؤ، آؤ —'' مرجینا نے سندباد کو دیکھ کر خوشی سے ہاتھ ہلایا، ''بڑے اچھے وقت پر آئے۔ آج ہمارے پلے کی سلور جوبلی ہے، لہٰذا یہ کیک!''

چوروں نے دونوں کے لیے جگہ خالی کر دی۔ سندباد، علی بابا کے پاس بیٹھ گیا۔

''مبارک ہو!'' اس نے کہا، ''بڑا کامیاب گیا یہ کھیل۔''

علی بابا نے اپنے سفید عمامے پر سجے ہوئے نقلی موتیوں کے ہار کو درست کیا اور کہا، ''چوروں نے دل جیت لیے ہیں سب کے۔''

مرجینا نے کیک کے ٹکڑوں سے سجی دو پلیٹیں سندباد اور ناصر کے سامنے رکھیں، ''چوروں کے بعد قزاقوں کی باری ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا، ''ہمارا اگلا ڈراما ''سندباد کا ساتواں سفر'' ہوگا۔ کیا خیال ہے اس میں آپ کو بھی نہ شامل کیا جائے۔ کچھ حقیقت کا بھی ٹچ ہونا چاہیے۔ ہدایت کار احمد شیخ تو بہت پُر جوش ہیں اس معاملے میں۔'' مرجینا نے احمد شیخ کو آواز دی جو جھک کے کسی اداکار سے باتیں کر رہے تھے۔ احمد شیخ مرجینا کے قریب آیا، ''لو بھئی!'' مرجینا بولی، ''تم کہہ رہے تھے نا کہ سندباد والے کھیل میں اصلی سندباد کو اداکاری کرنے کی دعوت دیں گے، ذرا مزہ رہے گا، تو یہ رہے اصلی سندباد جہازی —'' مرجینا ہنسی۔

"مرحبا!" احمد شیخ نے سند باد سے مصافحہ کیا، "الف لیلہ تھیٹر بہت کامیاب جا رہا ہے شائقین میں، ہم یہاں ساری کہانیاں لوگوں کے سامنے پیش کریں گے تاکہ انھیں پتا چلے کہ الف لیلہ کے سب کردار، سب قصے اور سب عجوبے آج بھی زندہ اور موجود ہیں۔ اسی لیے سوچا کہ کیوں نہ تم بھی — اگر فی الحال کہیں باہر نہیں جا رہے ہو تو کیوں نہ ہم تمھارے ہی پچھلے سفر پر اپنا کھیل پیش کریں جس میں ایک جل پری روز تمھیں سمندری گیت سنانے آتی تھی۔ ٹھیک ہے نا؟"

سند باد ہنسا، "اچھا تو تم ایک ملاح کو ضرور اداکار بنا کے چھوڑو گے۔ خیر مجھے کوئی اعتراض نہیں، میں بھی سمندر کی ہوا کھاتے کھاتے اکتا سا گیا ہوں، اس لیے مہینے دو مہینے ابھی یہیں رہوں گا۔"

مرجینا نے ناصر کو دیکھا اور بولی، "تم نے اپنے دوست کا تعارف نہیں کرایا؟"

"ارے ہاں —" سند باد نے کہا، "ناصر ہے یہ، ابوعبید کے کشتیوں کے کارخانے میں کام کرتا ہے، اپنا دوست ہے، تم لوگوں سے ملوانے ہی لایا تھا۔"

سب چوروں نے ناصر کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا۔ مرجینا نے کہا، "کبھی آؤ ہمارا کھیل بھی دیکھو، یہ سارے جامعات کے طلبہ اور طالبات ہیں جو یہاں اداکاری کے جوہر دکھاتے ہیں۔ ان ڈراموں سے جو آمدنی ہوتی ہے، وہ ہم ویسٹ بینک میں فلسطینی بچوں کی تعلیم کے لیے بھیج رہے ہیں۔"

"یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔" ناصر نے کہا، "آپ بھی پڑھتی ہیں کیا؟"

"ہاں، میں ٹیکنالوجی اور فنون کی جامعہ میں ڈراما اور موسیقی کی طالبہ ہوں، الف لیلہ تھیٹر ہم سب نے مل کے قائم کیا ہے، بڑا اچھا وقت گزرتا ہے یہاں — تم کر سکتے ہو اداکاری؟" مرجینا نے پوچھا۔

"کبھی کی تو نہیں مگر مجھے سب اداکار، موسیقار، گانے اور رقص کرنے والے اچھے لگتے ہیں، میں خود گانا وانا تھوڑا بہت گا سکتا ہوں۔ چاندنی راتوں میں جب سارا سمندر، چاندی کا بنا ہوا لگتا ہے، میں ساحل پر رات گئے تک اپنی آواز پانی میں بہاتا رہتا تھا، پتا نہیں سمندر کی



لہریں میری تک بندی کن سرزمینوں تک پہنچاتی ہوں گی۔" ناصر نے کہا۔

"اچھا،" مرجینا ہنسی، "اب پتا چلا، تھوڑی سی شاعری بھی کر لیتے ہو تم! بھئی تم ضرور یہاں آتے رہنا، مزے دار آدمی ہو اور اپنے مزاج کے۔"

اسی وقت سند باد اٹھ کھڑا ہوا، "چلو ناصر! ہمیں موکھی کے شیشہ گھر میں بھی جانا ہے۔"

"موکھی کا مے خانہ کہو، شیشہ گھر تو نام ہے۔" مرجینا نے مسکرا کے کہا، "عجمان کے ساحل پر ڈھکا چھپا شراب خانہ ہے وہ تو — اچھا تو تم وہاں بھی آتے جاتے ہو، بڑی بدنام جگہ ہے بھئی۔" پھر وہ ناصر کی طرف دیکھ کے بولی، "تم ذرا بچ کے رہنا۔ وہاں شہر کے سارے شرابی آدھی رات کے بعد جمع ہو کے غل غپاڑہ مچاتے ہیں۔"

وہ لوگ آدھی رات سے پہلے موکھی کے شیشہ گھر میں پہنچ گئے۔ ناصر نے دیکھا وہ ساحل کے ایک سنسان گوشے میں چھوٹا سا سجا سجایا ریستوراں تھا جس میں ہر میز کے پاس ایک خوب صورت بلوریں حقہ موجود تھا۔ "تو یہ ہے 'موکھی کا شیشہ گھر' —" ناصر نے کہا، "دل چسپ جگہ ہے۔"

اندر اندھیرا تھا کیوں کہ وہاں موم بتیوں کی روشنی میں کاروبار جاری تھا۔ مختلف میزوں پر لوگ بیٹھے شیشہ پی رہے تھے۔ سند باد نے کہا، "یہاں بدذوقوں کے لیے چائے اور کافی کا بھی انتظام ہے۔ چاہو تو شیشے سے دل بہلاؤ۔" اس نے ایک حقے کی خوب صورت نے کو دانتوں میں دبایا، "مگر دل والوں کے لیے دیگر مشروبات اور 'ممنوعات' بھی موجود ہیں، ہمتِ مرداں، مددِ خدا۔"

ہر قسم کا نشہ فضا میں تیر رہا تھا اور فضا دھواں دھواں ہو رہی تھی۔ ناصر سند باد کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی نظر دو جوان لڑکوں پر پڑی جو نیم تاریکی میں ریستوراں کے گاہکوں کو اپنے انوکھے آرکسٹرا سے محظوظ کر رہے تھے۔ ایک لڑکا چنگ بجا رہا تھا اور دوسرا گھنگھرو چھنکا رہا تھا۔ کبھی کبھی وہ گھنگھرو چھوڑ کے ایک چمٹے سے راگ کی آگ تیز کرنے لگتا۔ ان کے چہروں پر ہلکی ہلکی داڑھیاں تھیں اور انھوں نے پیلی جرسیاں اور نیلی جینز پہن رکھی تھیں۔ دونوں لڑکے اپنے ساز بجاتے ہوئے ان کی میز کے پاس آئے تو ناصر نے انھیں

روک لیا، ''کہیں تم بیجل اور راجا تو نہیں؟'' اس نے پوچھا، ''یاد ہے تم نے بھٹ شاہ میں عرس کے موقع پر ایک ٹیبلو میں کام کیا تھا، کیا شان دار شام تھی وہ۔''

دونوں ٹھہر گئے، ''میں بیجل بنا تھا آپ نے ٹھیک پہچانا۔'' ایک نوجوان نے چنگ ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا، ''میرا نام خیرا ہے اور یہ شکورا۔'' اس نے دوسرے نوجوان کی طرف اشارہ کیا، ''اس نے اس روز جونا گڑھ کے راجا رائے ڈیاچ کا سوانگ بھرا تھا۔''

''مگر تم لوگ یہاں کیسے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہم اب ادھر ہی آگئے ہیں۔'' خیرا عرف بیجل نے کہا، ''تھوڑا بہت بزنس ہے ہمارا، ایران سے زعفران اور خشک میوہ منگواتے ہیں یہاں، بادام، اخروٹ، پستہ اور تخم صنوبر — اور دوسروں ملکوں کو بھیجتے ہیں، قادر ہوٹل کے پاس مرشد آباد میں دکان ہے ہماری، شاید آپ نے ہمارے پارٹنر کا نام سنا ہوگا، مشہور تاجر ہے یہاں کا، فریدون خستہ تن۔''

''ہاں ہاں!'' ناصر نے کہا، ''اس کا نام تو میں نے سنا ہے بلکہ اس سے ملاقات بھی ہوئی ہے۔ چلو ملتے جلتے رہنا چاہیے۔''

''ضرور۔'' دونوں نوجوان ایک ساتھ بولے، ''موکھی کے شیشہ گھر میں ہم ہفتے میں ایک دو بار تو ضرور آتے ہیں، موج مستی کے لیے۔''

''مگر 'موکھی کا شیشہ خانہ' یہ ہے کیا بھلا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ارے آپ نہیں جانتے۔'' بیجل بولا، ''مومل رانو کی کہانی میں وہ جو اس کی چالاک کنیز ہوتی ہے نا ناتر، یہ ڈیرہ اس کی بیٹی موکھی کے نام پر ہے۔''

بیجل ہنسا، ''مگر وہ شراب خانہ تھا جہاں موکھی نے کچھ لوگوں کو اس مٹکے سے شراب پلا دی تھی جس میں ایک سانپ مر گیا تھا۔''

''اور وہ زندہ رہے؟'' ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

ہاں سانپ مر گیا تھا مگر وہ زندہ رہے تھے مگر ہوا یوں کہ جب بہت دنوں بعد وہ لوگ دوبارہ وہاں آئے اور اسی مست کر دینے والی شراب کے طلب گار ہوئے تو موکھی نے انھیں سانپ والی شراب کا قصہ سنا دیا۔ وہ یہ قصہ سن کے اتنے دہشت زدہ ہوئے کہ بغیر کچھ پیے مر



گئے۔'' بیجل بولا۔

''اچھا تو 'موکھی کا شیشہ خانہ' گویا اسی قصے کی یادگار ہے؟'' ناصر نے کہا۔

''ہاں، یہ شیشہ گھر ہم نے روپ چند مہاجن کے ساتھ مل کے کھولا ہے، وہ بھی ٹھٹھے کا رہنے والا ہے مگر بچپن میں اپنے پتا ماتا کے ساتھ بمبئی چلا گیا تھا۔ پچھلے دس پندرہ سال سے وہ یہاں کاروبار کر رہا ہے، یہ جو موکھی کا اڈّا ہے نا، یہ شراب خانہ کم احباب خانہ زیادہ ہے، بس کچھ دوست اپنی یادیں تازہ کرنے یہاں آجاتے ہیں، تھوڑی بہت شراب بھی چلتی ہے، ورنہ بس بیٹھے دھواں اُڑاتے رہتے ہیں۔'' وہ بولا۔

''ویسے بھی اب تو موکھی کی شراب سے زیادہ زہریلی چیزیں موجود ہیں، مرنے یا شاید زندہ رہنے کے لیے۔'' اب کے راجا نے کہا، ''لوگ طرح طرح کے قصے سناتے ہیں۔''

''کیسے قصے؟'' ناصر نے پوچھا، اسے بیجل اور راجا کی باتوں میں مزہ آرہا تھا۔ موکھی کے مے خانے میں باتیں بھی نشیلی ہوتی ہیں، اس نے سوچا۔

بیجل نے کہا، ''یہ جو نشئی ہوتے ہیں نا صاحب، ان میں ایسے ایسے فن کار پڑے ہیں جن کے لیے موکھی کی شراب کافی نہیں۔ وہ اس میں مزید کیف آور سفوف اور گولیاں ملاتے ہیں، تب کہیں جا کے ان کی خوراک پوری ہوتی ہے۔''

راجا نے کہا، ''ایک آدمی کو دیکھا وہ اپنے ساتھ تھیلا بھر کے کریڈٹ کارڈ لاتا ہے، مختلف بینکوں کے — پھر وہ شراب کا جام حلق میں اُنڈیلنے سے پہلے اپنا ایک ایک کریڈٹ کارڈ اس میں ڈبوتا ہے، کہتا ہے، اس سے اس کا نشہ بڑھتا ہے، پاگل خانہ۔''

''نشہ بڑھتا ہے یا نشہ ہرن ہوتا ہے؟'' ناصر بولا، ''بینکوں کا کریڈٹ کارڈ تو خود کسی زہریلے سانپ سے کم نہیں۔''

''یہی تو کہتا ہے وہ۔'' بیجل نے کہا، ''کریڈٹ کارڈ کا نشہ وہی ہے جو موکھی کی پرانی شراب کا ہے جس میں سانپ مر گیا ہو۔''

ناصر نے دیکھا، دور ایک اندھیرے گوشے میں سندباد کسی لڑکی کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ ایک فلپائنی لڑکی تھی اور ان دونوں کے سامنے تازہ جام لبالب بھرے رکھے تھے۔ کچھ دیر بعد

سندباد اپنی میز سے اٹھ کے ناصر کے پاس آیا اور لڑکھڑاتی ہوئی آواز میں کہنے لگا، ''یار مجھے ابھی کچھ اور وقت لگے گا، وہ شان دار کشتی دیکھ رہے ہو نا سامنے جو تھوڑی دیر پہلے لنگر انداز ہوئی ہے، اس کے بادبان کھلنے کے لیے ہوا کے تازہ جھونکوں کے انتظار میں ہیں، میرا خیال ہے تم جاؤ، ثابت خاں تمھیں گھر پہنچا کے واپس لوٹ آئے گا۔''

ناصر نے باہر جاتے ہوئے سندباد کو لڑکی کے ساتھ عقبی حصے کی طرف بڑھتے دیکھا جہاں وہ دروازہ تھا جس سے ساحل کی طرف اترا جا سکتا تھا۔ کشتی کے سارے بادبان تنے ہوئے تھے اور سندباد نئے سفر پر روانہ ہونے کے لیے ساحلی آسمان پر تاروں کو روشن ہوتے دیکھ رہا تھا۔

پتا نہیں یہ کون سی کشتی ہے، ناصر نے سوچا، اسے بوم تو ہرگز نہیں کہہ سکتے، شاید سم بک کہیں گے یا پھر کوتیا، زمروک یا پھر مرکب — خیر اپنی بلا سے، سندباد سے پوچھوں گا ایک دن۔ وہ آپ ہی آپ مسکرا دیا۔



# ۱۲

# کاغذ کے سپاہی

پروفیسر عظمت علی کو تاریک راہ داریوں سے گزار کے ایسے کمرے میں پہنچا دیا گیا جس کی دیواریں کالی تھیں اور ان پر سفید رنگ کے چوکھٹے سجے ہوئے تھے۔ انھیں ایک کرسی پر بٹھا کے ان کے دونوں ہاتھوں کو کرسی کے ہتھوں سے جکڑ دیا گیا۔ پھر ایک آدمی نے ان کی آنکھوں پر بندھی پٹی کھولنے کا حکم دیا۔

پٹیاں کھلیں تو پروفیسر عظمت علی نے کافی دیر کے بعد پہلی بار اپنی آنکھوں میں روشنی سماتے دیکھی۔ کمرے میں کوئی کھڑکی نہیں تھی مگر اس میں فرنیچر کی ترتیب ایسی تھی جیسے کسی مطب میں ہوتی ہے، خاص طور پر کسی آنکھوں کے ڈاکٹر کے مطب میں۔

پروفیسر عظمت علی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ انھیں وہاں کیوں لایا گیا ہے۔ وہ دو آدمی جنھوں نے راستے میں ان کی گاڑی روک کے انھیں زبردستی دوسری کار میں منتقل کیا تھا، اب ان کی کرسی کے دونوں طرف کھڑے تھے۔ ان کی کرسی کے پیچھے ایک شخص بڑی سی میز کے سامنے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے میز پر بہت سے اوزار رکھے تھے اور ایک کمپیوٹر ٹرمنل بھی۔ پروفیسر عظمت علی کو کہیں کوئی اسٹیتھو اسکوپ نظر نہیں آیا۔

پروفیسر عظمت علی نے پوچھا، ''میں کہاں ہوں اور مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟''

"طبّی معائنے کے لیے!" میز کے سامنے بیٹھا ہوا آدمی بولا۔

"کیسا طبّی معائنہ؟" پروفیسر عظمت علی نے بےچینی سے پوچھا، "میں بالکل ٹھیک ہوں۔"

"یہی تو مشکل ہے۔" وہ آدمی بولا، "ہمارے خیال میں آپ ٹھیک نہیں ہیں، سچ نظر نہیں آتا آپ کو؟ خیر کوئی بات نہیں، ابھی آپ کی آنکھوں کا معائنہ کیا جائے گا — میں ڈاکٹر ڈریکولا ہوں۔" اس نے دوسرے آدمیوں کو حکم دیا کہ وہ بجلی بجھا دیں۔ کمرے میں اندھیرا ہوگیا تو ڈاکٹر ڈریکولا نے ایک بٹن دبایا اور سیاہ دیوار پر سفید چوکھٹے میں اردو کی عبارت چمکنے لگی۔

ڈاکٹر ڈریکولا نے کہا، "اسے تو پڑھ سکتے ہوں گے آپ۔ خود آپ کا لکھا ہوا کالم ہے، ایک پھٹیچر اخبار میں۔ ذرا بلند آواز سے پڑھیے۔ خیر آپ چھوڑیے، میں خود پڑھتا ہوں، تلفظ کی کوئی غلطی ہو تو معاف کردیجیے گا، اردو پڑھنے کی اتنی عادت نہیں مجھے — بہرحال سنیے، لکھا ہے، یہ چوروں، غاصبوں اور قزاقوں کا معاشرہ ہے، اوپر سے نیچے تک، سب، ہر شعبے میں چوروں کا راج ہے۔ حکومت میں بھی سب —"

"دیکھا —" اس نے پھر کہنا شروع کیا، "آپ کی تحریر سے صاف پتا چلتا ہے کہ آپ کو نیک اور شریف لوگ کہیں نظر ہی نہیں آتے۔ یقیناً بڑی بھیانک بیماری ہے جناب کو۔"

"آگے چلیے۔" ڈاکٹر ڈریکولا نے پھر بٹن دبایا، سفید چوکھٹے میں عبارت بدل گئی۔

"اب دوسرا کالم پڑھتے ہیں — ایک بڑی شخصیت کے بارے میں آپ کا کالم ہے کہ اگر ان کے سر پر سینگ ہوتے تو بہت جچتے، بالکل یونانی دیومالا کے مینے تور کی تصویر کھینچ دی ہے آپ نے۔ آدھا بیل، آدھا آدمی۔"

"تیسری تحریر دیکھتے ہیں۔" سفید چوکھٹے میں پھر عبارت تبدیل ہوئی، "آہا —" وہ بولا، "آپ نے لکھا ہے کہ فوج ملک کے دفاع کے لیے بنائی گئی ہے مگر اب تک ملک کے عوام فوج کا دفاع کرتے آئے ہیں، اس کا مطلب سمجھا سکیں گے آپ؟"

پروفیسر عظمت علی نے کہا، "میں نے تو صرف تاریخی حقیقت بیان کی ہے۔ پچھلے برسوں کے واقعات دیکھے جائیں تو پتا چلے گا کہ فوج کی ناکامیوں نے عوام کو بار بار مایوس کیا ہے مگر انھوں نے پھر بھی اس کا دفاع کیا، نہ کسی کو سزا ہوئی، نہ کوئی اپنے عہدے سے ہٹایا گیا۔"



ڈاکٹر ڈریکولا طیش میں آکے بولا، "آپ کچھ زیادہ نہیں بولتے، اتنا بولنے کا آپ کو کس نے حق دیا ہے؟"

"میں بالکل زیادہ نہیں بولتا۔" پروفیسر عظمت علی نے کہا، "اور مجھے بولنے کا حق میرے ضمیر نے دیا ہے، لیکن میں جو کہتا ہوں اس کا ایک علمی اور تاریخی پس منظر بھی ہے۔ آپ کہتے ہیں مجھے ہر طرف لٹیرے اور قزاق کیوں نظر آتے ہیں — تو جناب میں سمجھتا ہوں کہ انسان اپنی سرشت میں قزاق اور لٹیرا ہے — حیران مت ہوں — اور شرمندہ بھی۔"

"یہ کیسے کہہ سکتے ہیں آپ؟" ڈاکٹر ڈریکولا بھنا کے بولا۔

پروفیسر عظمت علی نے جواب دیا، "یہ تو آدم کی سچی کہانی ہے۔ ذرا اس وقت کو یاد کیجیے جب اس سے کہا گیا تھا کہ دانۂ گندم کو مت چھونا مگر اس نے بات نہ مانی اور اسے چرا لیا۔ سزا کے طور پر اسے جنت بدر کردیا گیا تاکہ اپنی پہلی چوری کا کفارہ دنیا میں اچھا انسان بن کے ادا کرے — مگر — ہوا کیا، یہ دنیا تو اس کے لیے 'اصلاح گھر' تھی، اتنے سارے پیغمبر، ولی، امام اور روحانی پیشوا باری باری اسے یہ بتانے آئے کہ اچھا انسان کیسے بنتا ہے مگر یہاں آکے وہ قزاق سے قاتل بھی بن گیا۔"

"یہ محض الزام ہے —" ڈاکٹر ڈریکولا نے ڈپٹ کے کہا۔

پروفیسر عظمت علی مسکرائے، "ناراض مت ہوں، اس کے کرتوت دیکھیں — وہ کیا نہیں کرتا، دوسروں کا مال چراتا ہے، حق غصب کرتا ہے، قتل کرتا ہے اور سارے دینی اور دنیاوی قانون توڑتا ہے — اب اگر میں نے یہ بات لکھ دی تو کیا غضب کیا۔ میرا تعلق تو ایسے افراد سے ہے جو لوگوں کو سیدھے راستے پر رکھنا چاہتے ہیں، جب تک دنیا میں قاتل اور قزاق رہیں گے، ہم بھی موجود رہیں گے، ہم کالم نویس، صحافی اور ادیب تو ضمیر کی فوج کے ادنیٰ سپاہی ہیں۔"

"کاغذی سپاہی کہو!" ڈاکٹر ڈریکولا گرجا، "کاغذی سپاہیوں پر مشتمل تمھارا لشکر دیوتاؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، اصل پرابلم تمھاری آنکھ کا ہے، اسے ٹھیک کرنے کی ضرورت ہے تاکہ تمھاری کج نظری دور ہوسکے۔" اس نے اشارہ کیا تو پروفیسر عظمت علی کو ایک ایسی

عینک پہنا دی گئی جس میں برقی تار لگے تھے۔ ڈاکٹر ڈریکولا نے بٹن دبایا، کچھ روشنیاں چمکیں اور پروفیسر عظمت علی کی آنکھوں میں درد کی تلوار چمکی اور دور تک اندھیرا پھیل گیا۔ صرف چیخ تھی جو ان کے گلے میں گھٹ کے رہ گئی۔

بہت دیر بعد پروفیسر عظمت علی کو ہوش آیا تو ان کی عینک اتاری جا چکی تھی اور انھیں ایک بنچ پر لٹا دیا گیا تھا۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ ان کی آنکھیں مر چکی تھیں۔

''یہ تمھارے فائدے کے لیے ہے، اب تمھیں چور، لٹیرے، غاصب اور قزاق نظر نہیں آئیں گے، بڑی تکلیف ہوتی تھی نہ ان سے تمھارے ضمیر کو۔ اب تم کچھ پڑھ نہیں سکو گے، کچھ لکھ نہیں سکو گے — کتنی پُرسکون زندگی ہوگی تمھاری — اور ہماری بھی۔'' ڈاکٹر ڈریکولا کی آواز جیسے کسی گہرے کنویں میں سے آئی۔

''یہ تیری غلط فہمی ہے ظالم شخص!'' پروفیسر عظمت علی نے کراہ کے کہا، ''آنکھ نہیں رہی تو کیا ہوا، میں ابھی سن تو سکتا ہوں، بول بھی سکتا ہوں۔''

''ارے واقعی — یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں تھا۔'' ڈاکٹر ڈریکولا ہنسا، ''چلو اس کا بھی کچھ علاج کرتے ہیں۔'' اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا جو پروفیسر عظمت علی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھے اور کمرے میں مزید اندھیرا ہو گیا۔



# ۱۳

# خوش حالی کا جن

شام ہونے والی تھی۔ ناصر نے اپنے رہائشی کیبن سے نکل کے کارخانے کا ایک چکر لگایا۔ جمعے کا دن ہونے کی وجہ سے چھٹی تھی اور سارے سیکشن خالی تھے۔ اس حصے میں جہاں نئی کشتی کا چوبی ڈھانچا تیار کیا جا رہا تھا، شیشم کی لکڑی کے تراشیدہ شہتیر اور تختے ترتیب سے رکھے ہوئے تھے۔ ہوا گرم تھی اور صحرا کی جانب سے آنے والے ریت کے بگولے کارخانے میں گرد و غبار پھیلا رہے تھے۔

اگرچہ سندباد سے کئی دن سے ملاقات نہ ہوئی تھی مگر ناصر کو رہ رہ کے اس کا خیال آ رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ آج خود ہی 'موکھی کے شیشہ گھر' کا چکر لگائے یا پھر الف لیلہ تھیٹر میں جھانک کے دیکھے کہ مرجینا اور اس کے ساتھی کس ڈرامے کی تیاری کر رہے ہیں۔

وہ کارخانے سے باہر نکلا ہی تھا کہ سامنے سے اسے نائر ایک سفید ٹویوٹا کار میں آتا دکھائی دیا جو اتنی خستہ حال تھی کہ انجر پنجر ہل رہا تھا۔ اس نے گاڑی روک دی اور پوچھا، ''کدھر کی تیاری ہے، کہو تو میں چھوڑ دوں وہاں؟''

''نائر بھائی!'' ناصر نے شرارت سے کہا، ''تمھارا شکریہ مگر مجھے ذرا جلدی پہنچنا ہے، تمھاری گاڑی کو چلنے کے لیے شاید دھکے کی ضرورت پڑے گی، دو اور سواریاں بٹھا لو۔ ویسے

تعجب ہے یہ ابوعبید کی کار ہے؟"

"نہیں، نہیں — یہ میری گاڑی ہے بھئی۔" نائر بولا، "خوب صورت نہیں مگر خوب سیرت ہے اور تمھاری توقع کے برعکس خوب دوڑتی ہے۔"

"اگر یہ بات ہے تو پھر اسے دوڑا کے دکھاؤ — جمیرا چل سکتے ہو، الف لیلہ تھیٹر کی طرف!" ناصر نے کہا۔

"کیوں نہیں، آؤ بیٹھو۔" اس نے کہا۔ ناصر برابر والی نشست پر بیٹھ گیا تو نائر نے چابی گھمائی اور جیسے کار کو چمکار کے بولا، "چل شہزادی۔"

اسے مرجینا کینٹین ہی میں مل گئی۔ وہ ایک لڑکے کے ساتھ بیٹھی تھی۔ کہنے لگی، "آؤ ناصر ان سے ملو، یہ ہیں عبدالرحمٰن شوقی، ہندی اتنی اچھی آتی ہے کہ فلمی گیتوں کے دریا بہا دیتے ہیں، بالی ووڈ کی فلموں کے عاشق اور امیتابھ، دھرمیندر اور ہیما مالینی کے پرستار۔"

ناصر نے کہا، "واقعی — اچھا ذرا گا کے تو سناؤ کوئی گانا۔"

"شوقی نے کہا، "ابھی لو۔" پھر اس نے بلاتکلف تان لگائی:

جو دل پیار کرے گا، وہ گانا گائے گا

دیوانہ سیکڑوں میں پہچانا جائے گا

ناصر نے کہا، "یہ تو برسوں پرانا گانا ہے، ہیما مالینی جی کے بچپن کا۔"

شوقی بولا، "پیار بھی تو پرانا ہے۔"

شوقی کچھ دیر مختلف ہندی فلموں کے ڈائیلاگ اور اپنی پسندیدہ ہیروئنوں پر فلمائے گئے گیت سناتا رہا پھر بولا، "مجھے ابھی پیراڈائز سینما میں "شعلے" کا دوسرا شو دیکھنے جانا ہے، بار بار دیکھتا ہوں جی نہیں بھرتا۔"

"کتنی بار دیکھی ہے یہ فلم؟" ناصر نے پوچھا۔

"دس بار دیکھی ہے، ایک بار پھر دیکھنے کی ہوس ہے۔" شوقی بولا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔

اس کے جانے کے بعد مرجینا نے کہا، "موصوف کھسکے ہوئے تو ہیں ہی، خاصے دل پھینک بھی ہیں، ہماری ڈراما ٹیم کی ہر لڑکی سے شادی کرنے کی خواہش کا اظہار کر چکے ہیں۔"



ناصر نے کہا، "ان کی عمر اور فراخ دلی کو دیکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ ان کی کم از کم شادیاں تو اب تک ضرور ہو چکی ہوں گی۔"

"ہو سکتا ہے — ویسے بھی حکومت مقامی لڑکوں کو روزگار، شادی اور ذاتی گھر کے لیے امداد بھی دیتی ہے۔" مرجینا نے کہا۔

"پھر تو شادی نہ کرنے سے بڑی بے وقوفی اور کوئی نہیں ہو سکتی۔" ناصر ہنسا۔

"اور مالی فراغت ہونے کی وجہ سے یہاں کے نوجوان چار مرتبہ اس عملی عقل مندی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔" مرجینا نے بھی ہنس کے کہا۔

ناصر بولا، "کیا بات ہے آج آپ بھی فارغ بیٹھی ہیں، آج کوئی ڈراما اسٹیج نہیں ہوگا؟"

مرجینا نے جواب دیا، "آج دوسرا گروپ ڈراما پیش کرے گا! ہماری آج کی چھٹی۔"

ناصر نے پوچھا، "آپ لوگوں کا اگلا ڈراما کون سا ہوگا؟"

مرجینا نے کہا، "ایک لمبی فہرست ہے، "سند باد جہازی کے سفر" کے علاوہ عرب دنیا کی سیاست کے بارے میں ایک کھیل تیار ہے، "پیرِ تسمہ پا —"

"مگر یہ ذرا خطرناک کھیل نہیں؟" ناصر نے پوچھا، "مصر، شام، سعودی عرب، لیبیا، مراکش، عراق، یمن کہاں 'پیرانِ تسمہ پا' موجود نہیں — آپ کو اجازت ملے گی اس کی؟"

"دیکھا جائے گا۔" مرجینا بولی، "ویسے بھی ہم تو الف لیلہ کو زندہ کر رہے ہیں، ہمارا سیاست سے کیا لینا دینا — بھئی ہم تو الہ دین کی زندگی کا ایک ورق پیش کر رہے ہیں عہدِ جدید میں، اس کے پاس خوش حالی کا جن ہے، اگرچہ ہے وہ بھی چراغ کا جن جس میں تیل جلتا ہے۔"

"تو یہ کہانی تو تیل کی ہوئی۔" ناصر بولا۔

"مگر یہ بھی 'الف لیلہ' کی داستان ہوئی نا —" مرجینا نے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ لا کے کہا۔ تیل کے سوداگروں کے بھیس میں پھر چالیس چور علی بابا کے گھر میں گھس آئے ہیں۔"

ناصر نے کہا، "مرجینا کی ذمے داریاں بڑھ گئی ہیں بڑا چیلنج ہے اس کے لیے، کیسے ان چوروں کو گھر سے نکالے۔ ویسے تم تو اس کردار میں ایسی ڈھل گئی ہو کہ بالکل مرجینا ہی

لگتی ہو۔ مجھے یقین ہے مرجینا بھی ایسی ہی ہوگی۔''

مرجینا پھر ہنسی، ''ہاں، اب سب مجھے مرجینا ہی کہتے ہیں، میرا اصل نام حیا تو سب لوگ بھول ہی گئے۔ میں بار بار خود کو یاد دلاتی رہتی ہوں کہ میں حیا ہوں، مغربی کنارے کے ایک شہر راملہ کی رہنے والی۔''

اسی وقت ایک اور نوجوان ان کے پاس آ کے بیٹھ گیا۔ ''واہ کیا بات ہے—'' اس نے مرجینا کو داد دی، ''تمھارے شہر میں رام اور اللہ دونوں اکٹھا ہو گئے ہیں پھر بھی وہاں امن قائم نہیں ہو سکا۔''

مرجینا نے کہا، ''لو بھئی، اب یہ ہندی دانش ور بھی آ پہنچے، کیلاش رام چندانی ہے ان کا نام۔'' پھر وہ کیلاش کی طرف متوجہ ہوئی، ''یہ سچ ہے اس سرزمین پر پورا آسمان نیچے اتر آیا ہے، سارے عظیم پیغمبر، خدا بھی اور 'خدا کا بیٹا' بھی، پھر بھی امن کی کوئی صورت نہیں، ہے نا حیرت کی بات؟''

کیلاش نے کہا، ''مگر آکاش والے کیا کریں جب ہم دھرتی والے ان کی بات ہی نہیں مانتے، بھگوان نے اتنے سارے نبی، اوتار، ہدایت کرنے والے بھیجے مگر ہم ان کی ہر ہدایت، ہر نصیحت بھول جاتے ہیں، نتیجہ— لڑائی، دنگا فساد، انسان دشمنی— خیر، بات راملہ کی ہو رہی تھی، تو تم وہاں پیدا ہوئیں۔''

''ہاں۔'' مرجینا نے کہا، ''جب میں پیدا ہوئی تھی راملہ غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا مگر میں چاہتی ہوں کہ جب میں مروں تو ایک مکمل طور پر آزاد ملک میں جان دوں۔''

ناصر نے کہا، ''خیر فکر مت کرو، یہ بھی ہو رہے گا، ایک دن تمھارا ملک آزاد ہو جائے گا، مکمل طور پر ایک فلسطینی ریاست قائم ہو کے رہے گی مگر تمھیں بھی اس کے لیے زندہ رہنا ہوگا، ویسے تم کس کی حامی ہو، الفتح یا حماس؟''

مرجینا نے کہا، ''میں ان کی حامی ہوں جو چوروں کا ساتھ نہ دیں اور قاتلوں کو ہیرو نہ بنائیں۔''

ناصر نے پوچھا، ''ویسے تمھارا ہیرو کون ہے؟''



مرجینا نے کہا، ''یاسر عرفات! ایک بار بچپن میں بابا کے کندھے پر سوار ہو کے ان پر میں نے پھول پھینکے تھے جب وہ ایک جلسے میں تقریر کر رہے تھے، پھر بیروت میں فلسطینیوں کے کیمپ پر لبنانی جنگ جوؤں کے حملے کے بعد جس میں میرے بابا شہید ہو گئے تھے، میں نے انھیں قریب سے دیکھا۔ انھوں نے ہماری ہمت بڑھائی اور بہادری سے ڈٹے رہنے کی نصیحت کی— میرے چچا کو انھوں نے اپنے ذاتی عملے میں شامل کر لیا اور انھوں نے مجھے پالا۔''

ناصر نے کیلاش سے پوچھا، ''آپ بھی 'الف لیلہ تھیٹر' کے رکن ہیں؟''

مرجینا نے کہا، ''کیلاش ہمارے آرکسٹرا میں شامل ہیں اور پیانو بجاتے ہیں مگر پیشے کے اعتبار سے آرکی ٹیکٹ ہیں— ہمارے بہی خواہوں میں شامل ہیں۔''

کیلاش نے ناصر سے پوچھا، ''اور آپ؟''

ناصر نے جواب دیا، ''میں بھی 'الف لیلہ تھیٹر' کے پرستاروں میں ہوں، ویسے کشتیوں کے کارخانے میں کام کرتا ہوں۔''

مرجینا نے کافی منگائی اور پھر ناصر سے کہنے لگی، تم ہمارے لیے ایک ایسی کشتی بناؤ، کشتی نوح جیسی جس میں ہم دنیا کے سب مظلوموں، دکھی لوگوں اور آفت زدہ انسانوں کو قاتلوں اور لٹیروں کے بپھرے ہوئے سمندر سے بچا کے امن و انصاف کے ساحلوں تک پہنچا سکیں۔''

ناصر نے کہا، ''کشتی تو بن جائے گی مگر اس کا ناخدا کون ہوگا، سندباد کے متعلق کیا خیال ہے؟''

مرجینا ہنسنے لگی، ''سندباد تو ہرگز نہیں، تمھیں پتا نہیں اس کے سمندری سفر کتنے عجیب ہوتے ہیں، ہر بار کوئی نہ کوئی خوب صورت بلا اس کے پیچھے پڑ جاتی ہے۔ ان کے ساتھ گئے تو پتا نہیں کسی اور ہی پُراسرار دنیا میں جا نکلیں گے، نا بابا۔''

اچانک کیلاش اپنی جگہ سے اٹھا اور الوداع کہہ کے کینٹین سے باہر چلا گیا جہاں دروازے پر ایک سانولی سی لڑکی بڑا سا کالا چشمہ لگائے کھڑی تھی۔ مرجینا نے کہا، ''لو آ گئی ...لی بھتنی۔''

''کون؟'' ناصر چونکا۔

مرجینا نے لڑکی کی طرف اشارہ کیا، ''دوست ہے اس کی، لتا نام ہے— اب وہ اسے کام تھوڑا ہی کرنے دے گی۔''

ناصر کافی کی چسکیاں لیتے ہوئے میز پر پڑے ہوئے ایک انگریزی اخبار پر نظر دوڑانے لگا۔ اچانک ایک خبر نے اسے بری طرح چونکا دیا۔ سرخی تھی:

مشہور کالم نگار اور ادیب پروفیسر عظمت علی کو
تشدد کے بعد قتل کر دیا گیا

یہ واقعہ پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں پیش آیا تھا۔ خبر کے مطابق پروفیسر عظمت علی کو اپنے گھر سے اخبار کے دفتر جاتے وقت اغوا کرلیا گیا تھا۔ کئی گھنٹے کے بعد ان کی نعش ایک گاڑی کی ڈگی سے ملی جسے ساحلِ سمندر پر ایک سنسان مقام پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان کی موت بے انتہا تشدد کی وجہ سے ہوئی تھی۔ پولیس کی تفتیش ابھی نامکمل تھی اور کیس کے بارے میں مزید تفصیلات سامنے نہیں آئی تھیں۔

ناصر کو اچانک حواس باختہ پا کر مرجینا بھی پریشان ہوگئی، ''کیا ہوا؟'' اس نے پوچھا۔

''بہت بری خبر ہے میرے لیے۔'' ناصر نے جواب دیا، ''ایک مشہور ادیب اور دانش ور کو قتل کر دیا گیا ہے جو میرے استاد بھی تھے۔''

''قتل کی وجہ؟'' مرجینا نے افسوس کرتے ہوئے پوچھا۔

''وجہ شاید صرف یہ کہ وہ معاشرے میں ناانصافیوں پر اپنے کالموں میں مسلسل تنقید کرتے رہتے تھے، مگر نتیجہ کیا نکلا، قاتل راج کر رہے ہیں۔'' ناصر نے دیکھا، اخبار کئی روز پرانا تھا۔ اس نے خبر پھاڑ کے اپنی جیب میں رکھ لی۔

مرجینا نے اسے تسلی دی، ''حوصلہ رکھو ناصر! ہمیں ان ہی کے خلاف تو لڑنا ہے، چوروں، قاتلوں اور غاصبوں کے خلاف— چاہے وہ کہیں بھی ہوں۔''

ناصر الف لیلہ تھیٹر سے نکل کے کچھ دیر شاپنگ مال کے باہر فوارے کے سامنے خاموش بیٹھا رہا۔ پھر اس نے اپنے غم زدہ دل کو سنبھالا اور سڑک پر آیا تا کہ گھر جانے کے



کوئی ٹیکسی روک سکے۔

ابھی وہ کچھ ہی دور گیا تھا کہ لال رنگ کی ایک پجیرو اس کے پاس آ کے رُکی اور کسی نے اسے پکارا۔ ناصر نے دیکھا، خیرا یعنی بجلی گاڑی چلا رہا تھا۔ آج اس کی داڑھی بڑے سلیقے سے ترشی ہوئی تھی اور نیلی جینز اور سفید جرسی میں وہ بڑا اسمارٹ لگ رہا تھا۔

''کدھر جا رہے ہیں؟'' وہ بولا، ''آئیے میں پہنچا دوں!''

ناصر نے کہا، ''مجھے تو بس اپنے گھر جانا ہے، کشتیوں کے کارخانے میں— تم نے شاید دیکھا ہوگا!''

''ابوعبید کا کارخانہ نا— کون نہیں جانتا۔ میں وہاں چھوڑ آؤں گا آپ کو—'' بجلی نے کہا، ''بس راستے میں دومنٹ کے لیے فریدون خستہ تن سے بات کرنی ہے۔''

''کہاں— دکان پر؟'' ناصر نے پوچھا۔

''نہیں اس وقت تو وہ گھر پر ہوگا۔ اتفاق سے بالکل قریب ہی ہے اس کا وِلا۔'' وہ بولا۔ ناصر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ چند منٹوں میں خستہ تن کے گھر پہنچ گئے۔ بہت خوب صورت گھر تھا۔

بجلی نے اتر کے صدر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ ناصر اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ گیٹ کھلا اور پٹھان چوکیدار باہر آیا۔ بجلی نے اس سے کچھ کہا اور چند لمحوں بعد خستہ تن دروازے پر آیا، ''آؤ اندر آؤ نا!'' وہ بولا۔

''اس وقت نہیں—'' بجلی نے معذرت کی، ''ایک دوست بیٹھا ہے گاڑی میں۔''

''کون؟'' خستہ تن نے گاڑی میں جھانکا، ''ارے ان سے تو میں مل چکا ہوں، ابوعبید کے دیوان خانے میں، ان کا نام ناصر ہے نا، کبھی انھیں دکان پر لاؤ۔''

''ضرور—'' بجلی نے کہا۔ پھر وہ دونوں کچھ دیر دھیمی آواز میں باتیں کرتے رہے۔ ناصر کو صرف پپی سنگھ بادل کا نام سمجھ میں آیا۔ چند لمحوں بعد بجلی واپس آ گیا۔

''اصل میں آج ہی ہمارا مال باہر گیا ہے۔ یہی میں اسے بتانے آیا تھا۔'' اس نے گاڑی چلاتے ہوئے بات شروع کی۔

"پپی سنگھ بادل کون ہے؟" ناصر نے پوچھا۔

"بادل ہمارے کنٹینر ٹرک کا ڈرائیور ہے، وہی تو یہاں سے سارا مال قطر، بحرین اور سعودی عرب پہنچاتا ہے— کبھی کبھی مسقط کا بھی چکر لگا لیتا ہے۔" بیجل نے جواب دیا۔

"یہ ٹریلر ڈرائیور بڑے جفاکش اور محنتی ہوتے ہیں، کئی کئی دن سفر میں رہتے ہیں۔" ناصر نے کہا، "میں نے ایک گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام کیا ہے، لہٰذا ان کی عادتوں سے خوب واقف ہوں!"

"اچھا، مجھے پتا نہیں تھا کہ آپ پہلے کسی ٹرانسپورٹ کمپنی میں کام کر چکے ہیں، پھر تو ہمارے کام کے ہوئے۔" بیجل بولا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا، "ہم لوگ سوچ رہے ہیں کہ ایک دو ٹریلر ٹرک اور خرید لیں، ہم اپنی برآمدات بڑھانے کو سوچ رہے ہیں۔ ابھی تو صرف پپی سنگھ بادل ہمارے ساتھ ہے اگر کاروبار بڑھا تو کئی اور ڈرائیور رکھنے پڑیں گے اور ان کی نگرانی کے لیے ایک منیجر— کیا خیال ہے، یہ نوکری اچھی نہیں رہے گی۔"

بیجل نے پھر بات آگے بڑھائی، "ابھی تو شکورا— ہاں وہی راجا، یہ سارے معاملات دیکھ رہا ہے مگر ہم لوگوں کو بیرونی دوروں پر بھی جانا پڑتا ہے، اس لیے ایک اور اعتماد کا بندہ ہمارے لیے ضروری ہو جائے گا؟"

ناصر نے کہا، "تو—؟"

"تو یہ کہ اگر آپ کو اس کام سے دل چسپی ہو تو دو ایک دن میں سوچ کے ہمیں بتا دیں۔" اس نے کہا، "خوب نبھے گی۔" ناصر نے کوئی جواب نہ دیا۔

کشتیوں کا کارخانہ آ گیا تھا۔ ناصر ہاتھ ملا کے گیٹ پر اتر گیا۔



# ۱۴

# محبّتوں کا پارسل

ناصر کارخانے کے گودام میں داخل ہی ہوا تھا کہ اسے ابوعبید کا پیغام ملا کہ وہ فوراً اس کے پاس آئے۔ ناصر اس کے دفتر میں گیا تو وہاں اس نے کئی لوگوں کو بیٹھے پایا، ان میں کچھ باہر والے افراد بھی تھے، عربی چوغوں میں جنھیں توپ، کنتورا اور ڈش ڈشا کہا جاتا ہے۔

ابوعبید نے اپنی عقیق کی تسبیح اوپر اٹھائی اور ناصر سے کہا، "آؤ، شیخ عمر بن سعد الصباح سے ملو، یہ کویت سے یہاں آ گئے ہیں اور انھوں نے یہ کارخانہ خرید لیا ہے۔"

ناصر کو شیخ صباح کی آنکھوں میں اپنے لیے ناپسندیدگی کی مدھم سی تحریر نظر آئی، "میں نے اپنے کاروباری دفاتر یہاں منتقل کر دیے ہیں، کویت میں تو کچھ بچا نہیں، خدا صدام کو غارت کرے۔" وہ بولا، "یہ کارخانہ مجھے پسند آیا، میں نے یہ سارے کا سارا کشتیوں سمیت خرید لیا ہے۔"

ابوعبید نے کہا، "تم گودام میں موجود سارے مال کی تفصیل ان کے لیے تیار کرو، یہ کام ابھی ہونا چاہیے۔"

"جی ارباب—" ناصر نے کہا، "بس گھنٹے دو گھنٹے لگیں گے۔ سارے کاغذات تیار ہو جائیں گے۔"

"شاباش!" ابوعبید نے کہا، پھر اس نے اپنی میز پر رکھا ہوا بھورے رنگ کا ایک بڑا سا پیکٹ اٹھایا۔ "ارے ہاں، یہ پارسل تمھارے لیے آیا ہے، شاید عمران کی طرف سے۔" اس نے پیکٹ ناصر کو پکڑا دیا۔ ناصر نے پارسل سنبھالا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

کام ختم کرنے میں اسے دو تین گھنٹے لگے جس کے بعد اس نے ساری فائلیں اور اشیا کی فہرست ارباب کے کمرے میں پہنچا دی۔

جب دوپہر کے کھانے کے وقت سب لوگ کارخانے کی کینٹین میں جمع ہوئے تو ناصر کو سارے چہروں پر تشویش کے بادل چھائے نظر آئے۔ شاید ہر آدمی یہ سوچ رہا تھا کہ نیا ارباب پتا نہیں کس کو نوکری میں رکھے اور کسے فارغ کردے۔ ابوعبید کے ذاتی معاون نائر کو بہرحال یہ یقین تھا کہ وہ ابوعبید کے ساتھ ہی رہے گا۔ اس نے ناصر کو بھی اطمینان دلایا کہ اگر اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہوا تو وہ ابوعبید سے بات کرے گا۔

شام کو گھر پہنچنے پر ناصر نے وہ پیکٹ کھولا جو عمران نے بھیجا تھا۔ اندر ایک موٹا سا رجسٹر تھا اور ساتھ ہی عمران کا خط۔ اس نے لکھا تھا:

"پیارے ناصر! سلام لو۔ تمھاری خیریت ابوعبید سے فون پر ملتی رہتی ہے۔ یہاں ہر لمحے کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے مگر میں بہت سی بری خبریں تم سے چھپاتا رہتا ہوں تاکہ پردیس میں تمھیں خوامخواہ پریشان نہ کروں لیکن پچھلے ہفتے پروفیسر عظمت علی کے ساتھ جو اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، اسے میں چھپانا بھی چاہوں تو نہیں چھپا سکتا۔ تم نے یقیناً اب تک اخبارات میں اس کے بارے میں ساری تفصیل پڑھ لی ہوگی۔

افسوس! ہم دونوں کے مہربان دوست اب اس دنیا میں موجود نہیں رہے۔ انھیں اغوا کرکے بڑی بے دردی اور بے رحمی سے مار دیا گیا۔ حسبِ توقع پولیس اب تک ان کے قاتلوں کا پتا چلانے سے قاصر ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ انھیں کیوں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ ان کے اخباری کالم اور کہانیاں بہت سے لوگوں کے لیے بڑی پریشان کن تھیں۔ جب سے انھوں نے مغربی پہاڑوں کے پرے سے اٹھنے والے کالے طوفان کے بارے میں ایک چیختا چلاتا کالم لکھا تھا، ان کے گھر کے گرد چکر لگانے والے مشتبہ افراد کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔



پروفیسر عظمت علی ان دنوں گھر سے بہت کم نکلتے تھے اور کچھ دنوں سے انھوں نے ایک نئی حفاظتی گارڈ کی خدمات بھی حاصل کر رکھی تھیں مگر شاید وہی حفاظتی انتظام ہی ان کے لیے خطرناک ثابت ہوا کیوں کہ پروفیسر عظمت علی کے قتل کے بعد سے وہ محافظ اب تک غائب ہے۔

"تمھیں پتا ہی ہے کہ مرحوم پروفیسر عظمت علی ہم لوگوں کے کتنے قریب تھے اور ہماری بہتری اور سلامتی کے لیے کس قدر دعائیں کرتے رہتے تھے، خاص طور پر اس رات کے بعد سے جب تین ہٹی پر تمھارے گھر میں تمھاری بیوی نوری سمیت تمھارے پورے خاندان کو مٹا دیا گیا تھا، وہ تمھاری سلامتی کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتے تھے۔

تمھاری بیٹی ماروی بلکہ یہ کہوں کہ ہماری بیٹی ماروی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے اور ویرا اس کی ایسی تربیت کر رہی ہے کہ وہ بڑی ہو کے بہت بہادر لڑکی بنے گی۔ پروفیسر عظمت علی کے ساتھ یہ واقعہ پیش آنے تک میں ہر ہفتے ماروی کو ان سے ملانے ان کے گھر لے جاتا تھا۔

تمھارے ساتھ پیش آنے والے واقعات اور تم پر اور تمھارے خاندان پر ٹوٹنے والے صدموں کا انھوں نے بڑا گہرا اثر قبول کیا تھا مگر وہ ہمیشہ تمھارے حوصلے اور صبر و ہمت کو بہت سراہتے تھے۔ تمھارے اور نوری کے تعلق سے انھوں نے 'ماروی کی واپسی' کے نام سے ایک ناول بھی لکھا تھا جس کا مسودہ میں تمھیں اس خط کے ساتھ روانہ کر رہا ہوں۔ اسے پڑھو اور ہمیشہ اپنے سینے سے لگا کے رکھو کہ اس میں ایک صاحبِ دل ادیب نے بڑے خلوص سے دو محبت کرنے والوں کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ اگرچہ یہ ناول ابھی ادھورا ہے اور تکمیل تک نہیں پہنچ پایا مگر میرے دوست، یہ مصیبتوں سے نبردآزما انسان کی ایسی کہانی ہے جو مکمل ہو جانے کے باوجود ہمیشہ ادھوری ہی رہتی ہے۔ اس ناول میں تمھارے دوست بادشاہ خان کا بھی ذکر ہے جنھیں پچھلے دنوں کراچی سے کابل کے درمیان سفر کے دوران تاوان کے لیے اغوا کرلیا گیا تھا۔ اب انھیں چھوڑ دیا گیا ہے مگر ٹرک پر جو سامان لدا ہوا تھا، وہ سب لوٹ لیا گیا۔ اپنا خیال رکھنا اور ہو سکے تو اپنی کوئی تازہ تصویر روانہ کرو تاکہ ہم اسے تمھاری بیٹی کو دکھا کے بتا سکیں کہ اس کے باپ نے اس کی خاطر کتنی بڑی قربانی دی ہے۔ والسلام تمھارا عمران۔"

ناصر نے خط تہ کر کے لفافے میں رکھا اور آنکھیں پونچھ کے بڑے احترام سے پارسل میں رکھے رجسٹر کو چھوا۔ پھر وہ بستر پر لیٹ گیا۔ اچانک اس کی نظر میز کے برابر میں رکھی کرسی پر پڑی۔ پروفیسر عظمت علی اس کے سرہانے بیٹھے تھے، ''مجھے امید ہے کہ تمھیں ہر وہ چیز یاد ہوگی جو یاد رکھنے کے قابل ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''بالکل جناب۔ بھلا میں کیسے بھلا سکتا ہوں اپنے سب مہربانوں اور ان کی مہربانیوں کو۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کتاب میں تمھارے سارے مہربانوں کا ذکر ہے۔'' انھوں نے رجسٹر کی طرف اشارہ کیا، ''میں نے وہ سارے واقعات جو تم سے اور عمران سے سنے تھے یا جو خود میرے سامنے ظہور میں آئے، پوری ایمان داری سے اس ناول میں لکھ دیے ہیں تاکہ پتا چلے کہ اہلِ دل کو قدم قدم پر کتنے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔''

''مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں کبھی نوری سے مل نہیں پایا مگر کوئی بات نہیں ماروی کی خوش بو سے میرا گھر مہکا رہتا ہے۔ اب اٹھو اور کتاب پڑھو۔''

ناصر نے آنکھیں کھولیں۔ اس کے کیبن میں صبح کا اجالا بھر گیا تھا۔ رات گزر گئی تھی اور کتاب اس کے سینے پر دھری تھی۔



# ۱۵

# کیفِ راہ گزر

صبح کی بارش سے ہوا میں سردی رچ گئی تھی اور فضا میں کہرا اپنے دودھیا پر پھیلائے ہوئے تھی۔ سائیں راول نے ترپال اور سرکنڈوں کے چھپر کے نیچے سبز پلاسٹک سے ڈھکے ہوئے لمبے سے کاؤنٹر پر چائے کی رنگ برنگی پیالیاں سجاتے ہوئے سڑک کی طرف دیکھا۔ اسی لمحے حیدرآباد کی سمت سے بٹائی ایکسپریس نمودار ہوئی اور فراٹے بھرتی ہوئی سیدھی کراچی کی طرف چلی گئی۔ مسافر کھڑکیوں سے لگے بیٹھے تھے۔ سائیں راول نے سوچا، انھیں چند لمحے بھی یہاں رکنا گوارا نہیں، خیر سائیں جاؤ ہمارا تو کام ہی انتظار کرنا ہے، تو نہیں اور سہی اور نہیں اور سہی۔

اس ویرانے میں — اس نے آہستہ سے ایک پیالی اٹھا کے جھاڑن سے صاف کی، صرف اسی لیے تو ہم نے اپنے خلوص کی دکان سجائی ہے کہ ہر وقت آپ کی خدمت کے لیے حاضر رہیں، آپ جب بھی یہاں آئیں گے ہمیں اپنی خدمت کے لیے تیار پائیں گے۔

سائیں راول نے چائے کی کیتلی کو ٹی کوزی کا کنٹوپ اوڑھا کے ایک لمبا سانس لیا اور جیب سے بیڑی کا بنڈل نکالا۔ اسی وقت ٹاٹ کے پردے کے پیچھے سے نوری نے جھانکا، ''بابا مانی کھالو! بھوک نہیں لگی کیا؟'' وہ سرکنڈوں کی دیوار کی دوسری جانب چھوٹے

سے باورچی خانے میں کھانا پکا رہی تھی۔ چولھے کی آگ کی تپش سے اس کے گال تمتما رہے تھے اور اس کی کاجل بھری آنکھیں جیسے جھلملاتے ہوئے تاروں کو قید کیے ہوئے تھیں۔

سائیں راول نے کہا، ''اچھا تو نے روٹی پکا لی بیٹی؟''

''ہاں بابا۔'' نوری بولی، ''مگر تمھیں کھانے کی فرصت بھی تو ہو—— چلو اس وقت تو کوئی گاڑی موجود نہیں، جلدی سے روٹی کھالو۔''

سائیں راول ہنسا، ''ہاں اس وقت تو ذرا فرصت ہے مگر کیا پتا دو گھڑی بعد کیا ہو، آنے والے اپنے آنے کی اطلاع تو دیتے نہیں۔''

نوری نے کہا، ''اسی لیے تو کہتی ہوں، موقعے سے فائدہ اٹھاؤ، پکڑو یہ برتن۔'' اس نے کھانا آگے بڑھایا۔

سائیں راول برتن تھام کے مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ رنگ برنگے دھاگوں سے کڑھی ہوئی خوش رنگ ڈلیا میں رکھی ہوئی روٹیوں سے ایسی مہک اٹھ رہی تھی کہ سائیں راول کو اپنے معدے میں خود بخود بھوک کی کھرچن محسوس ہونے لگی۔ اس نے پہلا نوالہ اٹھا کے منہ میں رکھا تو اسے یوں لگا جیسے اس کا سارا وجود کسی نہایت لطیف خوش بو سے مہک اٹھا ہو۔ لقمہ چباتے ہوئے اس نے اس کی سحر انگیز لذت کو اپنی روح کی گہرائیوں میں پھیلتے ہوئے محسوس کیا۔ اس نے سوچا صرف اسی خوش بو کی خاطر تو وہ ایک طویل فاصلہ طے کر کے یہاں تک آیا ہے اور سرِ راہے اپنی دکان سجائے بیٹھا ہے۔ پھر اسے یوں لگا جیسے روٹی کی مہک میں اس کی بیٹی نوری کے نازک ہاتھوں کی خوش بو بھی شامل ہے۔ اسے نوری کے لوچ دار خوب صورت ہاتھوں کا خیال آیا۔ اس نے سوچا دیکھتے ہی دیکھتے وہ کتنی بڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں میں سندھ کی تاروں بھری راتوں کا پُراسرار حسن گھلا ہوا تھا، اس کی باتوں میں کسی اکتارے کی جھنجھلاہٹ تھی اور اس کے آنچل میں پکی کھجوروں کی خوش بو—— مگر—— سائیں راول نے سوچا، ذہنی طور پر ابھی تک وہ وہی ننھی سی بچی ہے جو کبھی اس کی چھاتی پر لیٹ کے عمر کوٹ کے راجا اور ملیر کی ماروی کی کہانی سنتی تھی—— اگرچہ اب وہ اس کے پاس آنے سے جھجکتی ہے مگر کہانیاں سننے کا شوق اب تک نہیں گیا۔ روز رات میں جب وہ آنگن میں سونے کے لیے



لیٹتے ہیں تو نیم خوابیدگی کے عالم میں نوری کی آواز بار بار اسے چونکاتی ہے—— ''کیوں بابا، ماروی کو عمر کوٹ کیوں نہیں پسند تھا اور وہ لوگ اسے کیوں پکڑ کے لے گئے تھے، پھر سے وہی کہانی سناؤ نا۔''

''پھر سے——؟ سو جا نوری، بہت رات ہوگئی ہے، میں باقی کہانی کل سناؤں گا۔''

''اوہوں بابا۔'' نوری اٹھلاتی، ''مجھ تو ابھی نیند نہیں آ رہی۔''

تھی وہ بڑی ضدی، اس میں کوئی شک نہیں مگر اس کی ہر ضد اسے پوری کرنا ہی پڑتی تھی کیوں کہ اس کی ماں کے مرنے کے بعد سائیں راول نے خود ماں بن کے اسے پالا تھا۔ نوری تو اس کی جان، اس کا خواب، اس کے جیتے رہنے کی خواہش تھی۔ اس کی ساری جدوجہد، محنت اور مشقت نوری کے بہتر مستقبل کے لیے تھی، ورنہ سندھ کے ایک دور دراز قصبے سے یہاں آ کے آباد ہونا کیسی عجیب اور انوکھی بات تھی، اس کے لیے۔ پھر اسے بے اختیار اپنا گوٹھ یاد آیا۔ دادو سے پندرہ میل دور مغرب میں ایک قصبہ جس کا وجود دریائے سندھ سے نکلی ہوئی ایک نہر کا مرہونِ منت تھا۔ اس کی ساری زندگی گوٹھ میں فصلیں بوتے اور کاٹتے گزری تھی، باقی دن بھی شاید یوں ہی گزر جاتے مگر جب یہ نئی سڑک بنی تو گندم کی گھی چپڑی روٹی کی مہک اسے یہاں تک لے آئی۔

سائیں راول نے کھانا کھاتے ہوئے ایک بار سامنے دیکھا، حدِ نگاہ تک سپر ہائی وے کسی سیاہ ریشمی فیتے کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے سوچا اس سڑک کی وجہ سے اس ویرانے میں بھی کیسی رونق ہوگئی تھی۔ سڑک کے دونوں طرف دو رویہ دکانیں کھل گئی تھیں اور سرکنڈوں، ترپالوں کے چھپروں اور کچی دیواروں سے بنے ہوئے ان عارضی ڈھابوں میں ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ کھانے پینے کی چیزوں سے لے اخبار، رسالوں، بچوں کے کھلونوں اور سر درد کی گولیوں تک ہر وہ شے وہاں ملتی تھی جس کی ضرورت کسی کو سفر کے دوران پڑ سکتی ہے۔

سائیں راول کا ڈھابا بھی ان تمام رونقوں کا مرکز تھا۔ حیدرآباد اور کراچی کو جانے والی کاریں، بسیں، ٹیکسیاں اور اسٹیشن ویگنیں ذرا دیر کو وہاں رکتیں، مسافر اترتے اور کچھ دیر ستانے کے بعد اپنی اپنی راہ لیتے۔ کچھ دن تک سائیں راول کا چائے خانہ گم نام رہا، پھر

خود بخود اسے لوگ 'کیفے راہ گزر' کہنے لگے۔

اچانک سائیں راول کی آنکھوں کے سامنے ناصر کا ہیولا ابھرا۔ لمبے قد اور مضبوط شانوں والا گورا چٹا نوجوان جس کی آنکھوں میں خلوص کی چمک تھی اور باتوں میں ایسا مزہ تھا کہ سننے والے چاہتے کہ وہ بس بولتا ہی جائے۔ وہ چند دنوں میں ہی سائیں راول سے اتنا بے تکلف ہوگیا کہ اس سے بیڑیاں ادھار مانگ کے پینے لگا اور پھر اسے خاندانی معاملوں میں مشورے دینے لگا۔ اسی نے سائیں راول کے چائے خانے کا نام 'کیفے راہ گزر' رکھا تھا۔

پھر ایک دن جب وہ اپنی سفید ٹورسٹ وین 'رہ نورد' میں حیدرآباد جاتے ہوئے راستے میں رکا تو اس کے ساتھ ایک مستطیل سائن بورڈ بھی تھا جس پر جلی حروف میں 'کیفے راہ گزر' لکھا ہوا تھا۔ اس نے سائن بورڈ سائیں راول کو تھمایا اور کہا، ''لو چاچا، آج میں تمھارے لیے کیسا زوردار تحفہ لایا ہوں۔''

سائیں راول حیران رہ گیا، ''یہ کیا ہے بھئی؟''

ناصر ہنسا، ''تمھارے ہوٹل کا نام— بغیر نام کے یہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی سر کٹا۔''

ناصر، سائیں راول کو پسند تھا۔ اس کی بے تکلفی اور اپنائیت اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ ایک دن کہنے لگا، ''چاچا مجھے سندھی سکھاؤ نا، تم نے تو خوب اردو سیکھ لی— یہ چالاکی نہیں چلے گی، ویسے بتاؤں، مجھے سندھی میٹھی لگتی ہے، بس اس میں نقطوں کی فضول خرچی بہت ہے۔'' ناصر ہنسا۔ سائیں راول کو اس کی ہستی میں ایک قسم کی مردانگی محسوس ہوئی جو اسے پسند آئی۔

سائیں راول کھانا کھا کے ہاتھ دھو رہا تھا کہ فضا موٹر کے ہارن سے گونج اٹھی۔ نیلے رنگ کی ایک کوچ سڑک سے اتر کے اس کے ہوٹل کی طرف آ رہی تھی، اس پر لکھا ہوا تھا— 'مہران موج— حیدرآباد سے کراچی— براستہ سپر ہائی وے۔'

کوچ رُکی تو اس میں سے بہت سے مسافر اترے اور سائیں راول کے ہوٹل کے آگے سرکنڈے کے مونڈھوں پر بیٹھ گئے۔ سائیں راول ان کے لیے جلدی جلدی پیالیوں میں چائے اُنڈیلنے لگا۔ پھر چائے کی پیالی ایک مسافر کو تھماتے ہوئے اس نے سامنے دیکھا تو اسے ایک دراز قد آدمی اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ لمبا تڑنگا آدمی، جس نے سفید صافہ باندھ رکھا تھا، شانوں پر اجرک— نوکیلی مونچھیں بچھو کے ڈنک کی طرح اوپر اٹھی ہوئی اور کاندھے



...ہاے دار پھل والی کلھاڑی— آنکھوں میں سرمے کی لکیریں تھیں اور اس کے کالے جوتے ...ن پر سفید تاروں سے گل بوٹے بنے ہوئے تھے، بری طرح چرمرا رہے تھے۔ سائیں راول نے اسے غور سے دیکھا اور پہچان گیا۔ ''ارے!'' وہ خوشی سے اُچھل پڑا، قادر بخش کھوسو— اس کے بچپن کا ساتھی، اس کا دوست! وہ لپک کے آگے بڑھا۔ قادر بخش کھوسو قریب آیا تو اس نے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔

''السلام علیکم ادا!'' مصافحہ کر کے اس نے سائیں راول کو گلے لگایا، ''ادا خوش آیو، چنگو ...ھلا، تازو تگڑو! بیو سب...!''

سائیں راول نے کہا، ''اللہ سائیں کا احسان ہے— تم سناؤ— پھر اس نے قادر بخش کو اپنے قریب مونڈھے پر بٹھایا اور جلدی جلدی پیالی میں چائے انڈیل کے اسے پیش کی۔

''ہاں بھائی!'' سائیں راول انتظامات سے فراغت پا کے بولا، ''سناؤ خیریت تو ہے، یہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو، ادھر کیسے بھول پڑے، اچانک اپنے گرائیں کی کیسے یاد آگئی آج؟''

قادر بخش کھوسو نہایت اطمینان سے بڑے انہماک سے چائے پی رہا تھا۔ پھر وہ چند طویل گھونٹوں میں چائے کی پیالی خالی کر کے بولا، ''بہت تلاش کے بعد یہاں پہنچا ہوں۔ ...گوٹھ گیا تو وہاں پتا چلا کہ تم نے یہاں آ کے ہوٹل کھول لیا ہے۔''

سائیں راول نے کہا، ''بہت مہربانی دوست— تم نے میرے لیے اتنی تکلیف اٹھائی، ویسے تم آج کل کیا کر رہے ہو؟''

قادر بخش کھوسو نے شانوں کے گرد لپٹی ہوئی اجرک کی پھول دار چادر سے منہ صاف کیا اور کلھاڑی مونڈھے سے ٹکا کے اپنے جوتے اتارے پھر فرش پر بچھی ہوئی چٹائی سے اپنے پسیجے ہوئے پاؤں رگڑتے ہوئے بولا، ''لا یار ایک سگریٹ تو پلا!''

سائیں راول خود تو بیڑی پیتا تھا مگر اس نے قادر بخش کھوسو کے لیے شیشے کے مرتبان میں سے ایک کنگ اسٹارک سگریٹ نکال کے اسے تھمائی۔ قادر بخش کھوسو نے جیب سے ایک ...لی ڈبیا نکالی جس میں چرس کی گولیاں تھیں پھر اس نے دیا سلائی کی تیلی سے سگریٹ ...خالی کیا اور اس میں چرس بھرنے لگا۔ حسبِ منشا سگریٹ تیار کرنے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر سگریٹ جلا کے ایک دو طویل کش کھینچے۔ اس کے بعد سائیں راول

سے جو اس طویل مشق سے اکتا گیا تھا، بولا، ''تم میرے متعلق پوچھ رہے تھے۔''

سائیں راول نے کہا، ''مجھے یہ دیکھ کے خوشی ہوئی کہ تمھاری بے نیازی اور بے فکری آج بھی ویسی ہی ہے جیسی پہلے تھی۔ تم آج کل کیا کر رہے ہو، وہی پرانا دھندا؟''

قادر بخش کھوسو مسکرایا، ''کون سا دھندا، چوری اور ڈاکا زنی — نہیں چوری تو میں نے عرصہ ہوا چھوڑ دی ہے — آج کل وڈیرے کے یہاں کام کرتا ہوں۔ اسے میری ضرورت تھی، ظاہر ہے کہ وہ بہت بڑا وڈیرا ہے، سیکڑوں اس کے دشمن ہیں اور جس کے سیکڑوں دشمن ہوں، وہ کسی کا دوست نہیں ہوسکتا، میں اس کا ملازم ہوں اور میرا کام یہی ہے کہ میں کسی کو اس سے زیادہ دوستی بڑھانے نہ دوں۔''

سائیں راول نے کہا، ''یار وڈیرا تو بڑا ظالم آدمی ہے، بھلا تم وہاں کیسے جا پھنسے؟''

قادر بخش کھوسو نے زور کی ڈکار لی، ''وہ مجھے پسند کرتا ہے اس لیے کہ میں خود اس کی پسند کا خیال رکھتا ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ اس کی پسندیدہ چیزیں کہاں کہاں مل سکتی ہیں، ہم دونوں ایک دوسرے سے خوش ہیں۔''

سائیں راول نے کہا، ''چلو ٹھیک ہے مگر یہ تو بتاؤ تمھیں اچانک میری یاد کیسے آئی؟''

قادر بخش کھوسو نے کہا، ''ہاں یہ کام کا سوال ہے۔ بات یہ ہے کہ دوست، مجھے وڈیرے کے لیے ایک لڑکی کی تلاش ہے۔''

''ارے —!'' سائیں راول ہنسا، ''بھلا وڈیرے کو لڑکیوں کی کیا کمی ہوسکتی ہے۔''

''لڑکیوں کی کوئی کمی نہیں —'' قادر بخش کھوسو نے جواب دیا، ''مگر میرے بھائی لڑکی لڑکی میں بھی تو فرق ہوتا ہے نا۔ کچھ صرف رات کے اندھیرے میں اچھی لگتی ہیں اور کچھ ایسی ہوتی ہیں جن کی خوب صورتی اندھیرے اور اُجالے کی محتاج نہیں ہوتی، ایسی لڑکیاں تو راج کرنے کے لیے پیدا ہوتی ہیں۔ مجھے بھی کسی ایسی ہی لڑکی کی تلاش ہے جو وڈیرے کے دل پر راج کر سکے اور اس کے محل میں رانی بن کے رہے۔''

سائیں راول بات کی تہہ کو پہنچ گیا مگر اَن جان بن کے بولا، ''پھر ملی کوئی لڑکی؟''

قادر بخش کھوسو نے کہا، ''ابھی تو نہیں مگر میرے دوست تمھاری نوری کا کیا حال ہے — ماشاء اللہ اب تو وہ خاصی بڑی ہوگئی ہوگی۔''



سائیں راول کو اس کی یہ بات کچھ اچھی نہیں لگی اور وہ تیوری پر بل ڈال کے بولا، ''ہاں مگر تمھارا مطلب —؟''

قادر بخش مسکرایا، ''مطلب صاف ہے بڑے میاں — اگر تم راضی ہو جاؤ تو نوری وڈیرے کے گھر میں رانی بن کے رہے گی۔''

سائیں راول سکتے میں رہ گیا۔ اس نے کہا، ''تم ہوش میں تو ہو قادر بخش؟ نوری تو ابھی بہت چھوٹی ہے، بھلا میں اسے ابھی کیسے بیاہ دوں گا۔ تم میرے دوست ہو اور اس وقت میرے مہمان بھی، میں تمھاری عزت کرتا ہوں مگر یہ بات مجھ سے پھر نہ کہنا۔''

قادر بخش کھوسو سکون سے بولا، ''غصہ مت کرو دوست! تم انکار میں جلدی نہ کرو، کچھ دن سوچ لو، میں تمھارا جواب لینے پھر آؤں گا، مگر میں یہ ضرور کہوں گا کہ نوری کا خوش گوار مستقبل اور اس کا چین سکون تمھیں عزیز ہونا چاہیے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے جلدی جلدی جوتے پہنے اور اٹھ کے جانے کے لیے تیار ہوگیا۔ سائیں راول نے چند قدم ساتھ جا کے اسے رخصت کیا، پھر واپس آ کے اپنی نشست پر بیٹھ گیا۔ پردے کے پیچھے اسے نوری کی چوڑیوں کے کھنکنے کی آواز آئی۔ پھر اس نے آہستہ سے پوچھا، ''کون تھا بابا؟''

سائیں راول نے جواب دیا، ''ایسے ہی ایک دوست تھا بے چارہ، ملنے آ گیا تھا، تم آرام کرو۔''

اسی وقت ایک مسافر نے چائے کی طشتری میں پیسے رکھے جس سے جھنکار پیدا ہوئی۔ سائیں راول چونک گیا۔ سچ ہے، اس نے سوچا، پیسوں کی بڑی اہمیت ہے، ورنہ بھلا وہ اپنے گھر، اپنے بزرگوں کے گوٹھ سے اتنی دور کیوں آتا۔ دوری کے دکھ کیوں اٹھاتا۔ اس نے پیسے سمیٹ کے گلّے میں ڈالے۔ بات یہ ہے بلکہ سچی اور کھری بات یہ ہے کہ ہم اپنی آسائشوں کے غلام ہیں — زندگی اسی کا نام ہے۔ اس نے لمبا سانس لیا۔ قادر بخش کھوسو ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔ نوری وڈیرے کے یہاں راج کرے گی راج۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وڈیرے کے پاس پیسا ہے، زمینیں ہیں، ہل بیل ہیں، سیکڑوں ہاری ہیں، تو کیا میں ہاں کرلوں۔ خیر، اب کی بار قادر بخش آیا تو فیصلہ کن بات ہوگی۔

اچانک کسی گاڑی کا بریک لگنے کی چیخ سے اس کے خیالوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ ہوٹل کے سامنے سفید رنگ کی جانی پہچانی ٹورسٹ وین آ کے رُکی۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ناصر بیٹھا تھا۔ اس نے کھڑکی میں سے ہاتھ لہرا کے زور سے کہا، ''چاچا سلام۔''

وین کے مسافر باہر نکلے۔ سائیں راول نے جلدی جلدی ان کے لیے مونڈھے صاف کیے۔ ناصر اتنے میں ایک ٹوکری لیے ہوئے آیا، ''لو چاچا اپنی امانت سنبھالو۔''

سائیں راول نے پوچھا، ''یہ کیا ہے؟''

ناصر نے اپنی ٹوپی اتار کے جھاڑی اور کہا، ''کراچی سے پپیتے لایا ہوں تمھارے لیے۔ کھا کے دیکھو مزہ آ جائے گا۔ اور ہاں ذرا ایک جگ پانی تو دینا، گاڑی کا انجن پیاسا ہے بے چارہ!''

سائیں راول نے پپیتوں کی ٹوکری اس کے ہاتھ سے لے لی، ''تم نے یہ تکلیف کیوں کی؟''

ناصر نے کہا، ''تکلیف کیسی چاچا— راستے میں نظر آ گئے تو سوچا تمھارے لیے لیتا چلوں کراچی کا تحفہ۔''

سائیں راول نے ٹوکری پردے کے پیچھے نوری کو تھمائی اور جگ میں پانی بھر کے ناصر کو دیا۔ ناصر نے گاڑی کا بونٹ اٹھا دیا تا کہ انجن کو ہوا لگے پھر اس نے بھاپ چھوڑتے ریڈی ایٹر میں پانی ڈالتے ہوئے کہا، ''چاچا تمھیں حیدرآباد سے کچھ منگانا ہو تو بتاؤ، واپسی پر لیتا آؤں گا۔''

سائیں راول مسکرایا، ''بڑی مہربانی، فی الحال تو مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

ناصر نے کہا، ''ربڑی نہ لیتا آؤں قلعے کی۔''

''نہ نہ ادا، وری کچھ بھی نہ کھپے۔ توھنجی ڈاڈھی مہربانی۔'' سائیں راول گھبرا کے سندھی بولنے لگا۔ پھر وہ پردہ ہلا کے بولا، ''نوری! او نوری! ذرا ڈھو کے تو دینا۔'' پردے کی آڑ سے نوری نے ایک طشتری آگے بڑھائی جس میں زرد رنگ کی پکی ہوئی کھجوریں تھیں۔ سائیں راول نے پلیٹ تھام کے ناصر کو پکارا، ''آؤ ناصر! ذرا یہ کھجوریں کھا کے دیکھو۔''



ناصر نے پوچھا، ''کیسی کھجوریں؟''

سائیں راول نے کہا، ''بابا سکھر کے ڈھو کے ہیں، کھا کے تو دیکھو، شہد ہیں شہد۔''

ناصر نے کچھ کھجوریں کھائیں اور کچھ جیبوں میں بھر لیں۔ تمام مسافر چائے پانی سے نمٹ کے اب گاڑی میں بیٹھ چکے تھے۔ آخر ناصر نے سائیں راول کو خدا حافظ کہا اور گاڑی کی طرف چلا گیا۔

وین کے چلے جانے کے بعد سائیں راول اندر آیا تو نوری نے اسے پپیتا کاٹ کے کھانے کو دیا۔ وہ پپیتے کی قاشیں مزے لے لے کر کھاتا رہا اور ناصر کو بارے میں سوچتا رہا۔

رات میں سرکنڈوں کی دیوار کے پیچھے چھوٹے سے صحن میں سائیں راول بستر پر لیٹا ہوا سونے کی کوشش کر رہا تھا۔ نوری بھی صحن کے دوسرے گوشے میں اپنے پلنگ پر لیٹی تھی۔ چاندنی کا شامیانہ تنا ہوا تھا۔ نوری کا چہرہ دیوار کی طرف تھا اور وہ کچھ سوچ رہی تھی۔ اچانک اس نے پکارا، ''بابا! تم سو گئے کیا؟''

''نہیں تو بیٹی!'' سائیں راول نے جواب دیا، ''کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں بابا!'' نوری نے کہا، ''وہ کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی، ''تیری ناصر سے بڑی دوستی ہے اور کسی سے اتنی دوستی نہیں؟''

سائیں راول مسکرایا، ''بڑا اچھا لڑکا ہے وہ، بڑے خلوص سے ملتا ہے۔''

نوری نے کروٹ بدل لی۔ سائیں راول اسے غور سے دیکھتا رہا۔ اسے محسوس ہوا جیسے نوری منہ پھیر کے کچھ کھا رہی ہے۔ ذرا دیر بعد اسے فرش پر کسی طشتری کے گرنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے پلنگ سے اٹھ کے نوری کے بستر کے پاس گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کے سرھانے فرش پر تانبے کی ایک پلیٹ پپیتے کے چھلکوں کے اوپر اوندھی پڑی ہے اور نوری کسی ننھی بچی کی طرح نہایت بھولپن سے اپنے ہاتھ میں پپیتے کی ایک نرم قاش دبائے سو رہی ہے۔

سائیں راول نے دھیرے سے اس کے ہاتھ سے پپیتے کی قاش لے کر چادر سے اس کی ہتھیلی صاف کی اور پائینتی رکھی رلّی اُس کے بدن پر اوڑھا کے دبے پاؤں واپس آ گیا۔



# ۱۶

# ایشیائی جانور

دروازے پر مسلسل دستک ہو رہی تھی۔ ناصر نے کتاب بند کردی اور باہر نکلا۔ نائر کھڑا تھا، بولا، ''چلو کارخانے کے دفتر میں چلتے ہیں، سنا ہے وہاں کویتی ارباب کی طرف سے عملے کے ان ارکان کی فہرست لگی ہے جنھیں نوکری پر برقرار رکھا گیا ہے۔ باقی لوگوں کی چھٹی، جہاں سینگ سمائیں، چلے جائیں۔''

ناصر نے جلدی سے کپڑے بدلے اور نائر کے ساتھ کارخانے کے دفتر کی طرف چلا۔ وہاں بہت سے لوگ کھڑے تھے اور نوٹس بورڈ پر فہرستیں لگی تھیں۔

نائر نے طویل فہرست پڑھنا شروع کی۔ کہیں اس کا نام نہ تھا۔ ناصر نے بھی ناموں کے ہجوم میں اپنا نام تلاش کیا، وہ ابھی آدھی فہرست نہ پڑھ پایا تھا کہ نائر نے کہا، ''لسٹ پڑھنا بے کار ہے، جان لو کہ ہم دونوں ان لوگوں میں شامل ہیں جن کے لیے کارخانے میں جگہ نہیں ہے۔'' پھر وہ غصے سے بولا، ''یہ سالے کویتی — دیکھو ڈھونڈ ڈھونڈ کے انھیں نکالا ہے جو محنت سے کام کرتے ہیں یعنی ایشیائی گدھے — اس اصطبل میں اب صرف عربی النسل گھوڑے بندھیں گے۔''

ناصر نے کہا، ''کہاں یار! سب فلسطینی سانڈ بھی گئے، کیوں کہ ان سے سب کو شکایت





ہے کہ جہاں جاتے ہیں اپنا 'انتفاضہ' بھی ساتھ لے جاتے ہیں اور شیشے کے گھروں میں بڑی توڑ پھوڑ مچاتے ہیں۔''

نائر مسکرایا، ''ان بے چاروں کا خونِ ناحق تو یاسر عرفات کی گردن پر ہوگا جس نے اُس عراقی خچر کی حمایت کی تھی۔''

---

کارخانہ بیچنے کے بعد ابوعبید نے اپنی ساری توجہ اب اپنی شپنگ لائن کی ترقی اور توسیع پر کردی تھی۔ اس کا فلیگ شپ 'سلطان البحر' اب تجارتی سامان لے کر عدن، ممباسا اور زنجبار کے بحری راستوں پر رواں دواں تھا۔

نائر کو ابوعبید نے اپنے ساتھ رکھنے کا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ کشتیوں کے کارخانے میں اپنی رہائش ترک کر کے راشدیہ میں ابوعبید کے وِلا میں چلا گیا تھا جہاں اسے بہت اچھا سرونٹ کوارٹر رہنے کو مل گیا تھا۔

ابوعبید نے ناصر کو بھی اپنی کمپنی میں ٹھہرنے کو کہا مگر ناصر کا خیال تھا کہ اب وہ فریدون خستہ تن کی کمپنی میں بجل اور راجا کے ساتھ کام کرے گا۔ بجل نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس کے قانونی معاملات کو بھی درست کرائے گا کیوں کہ وہ پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر یہاں رہ رہا تھا۔

بجل نے ناصر کے لیے الکرامہ کے علاقے میں ایک کمرے کے فلیٹ کا انتظام بھی کردیا تھا مگر ابھی وہ کارخانے میں ہی رہ رہا تھا کیوں کہ الکرامہ کا فلیٹ خالی ہونے میں دیر تھی۔

ایک دن اسے بجل اپنے ساتھ مرشد بازار میں فریدون خستہ تن کی دکان پر لے گیا۔ وہ خشک میوہ جات، زعفران، باسمتی چاول اور سوکھی مچھلی کا آڑھتی تھا اور اس کے یہاں سے مال سعودی عرب، قطر، لبنان اور شام بھیجا جاتا تھا۔

دکان سے ملا ہوا اس کا گودام تھا جہاں سے ٹرکوں پر مال لادا جاتا تھا۔ گودام کے اوپر والے حصے میں بیرونِ ملک بھیجے جانے والے مال کی چھنٹائی، صفائی اور درجہ بندی ہوتی تھی جس کی نگرانی خود بجل اور راجا کرتے تھے، کسی اور شخص کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔

بیجل کی سفارش پر ناصر کو کمپنی کی طرف سے تنخواہ فوراً ہی ملنے لگی تھی مگر ابھی اس کی اصل ڈیوٹی شروع نہیں ہوئی تھی۔ فریدون خستہ تن نے بتایا تھا کہ پپی سنگھ بادل کی لبنان سے واپسی پر کم از کم دو کنٹینر ٹرک اور خریدے جائیں گے جس کے بعد اصل کام شروع ہوگا اور ناصر کو ٹرانسپورٹ کمپنی کی نگرانی کا کام سنبھالنا ہوگا۔

فی الحال اس کا کام یہ تھا کہ وہ کشتیوں کے ذریعے ایران، پاکستان اور ہندوستان سے آنے والے مال کا رجسٹر میں اندراج کرے اور اسے بحفاظت گودام میں منتقل کرائے۔

ادھر کشتیوں کے کارخانے میں صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی اور کویتی ارباب نے کارخانے میں دیواریں کھڑی کردی تھیں۔ ایک سیکشن کے عملے کو دوسرے سیکشن میں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ گاڑیاں کھڑی کرنے کے لیے بھی جو پہلے کارخانے کے باہر بڑا سا کار پارک موجود تھا اس میں شدید درجہ بندی کردی گئی تھی اور عام ملازمین کو وہاں اپنی گاڑیاں کھڑی کرنے کی ممانعت تھی اور اگر کوئی شخص غلطی سے اپنی گاڑی وہاں کھڑی کردیتا تو اس کی سرزنش کی جاتی۔

بہت سے لوگ اس بات سے بہت خوش تھے کہ نئے ارباب نے پرانی کھوکھے والی مسجد کی جگہ نہایت شان دار پکی مسجد تعمیر کرا دی تھی مگر ایک دن اس وقت بڑا ہنگامہ ہوا جب ایک کویتی نے نماز کے وقت اگلی صف میں کھڑے ایک پٹھان چوکی دار کو پچھلی صف میں جانے کی ہدایت کی۔ اس کے نتیجے میں موصوف کی پُرغرور ناک پر جو آفت آئی سو آئی، پٹھان چوکی دار کی نوکری بھی چلی گئی۔

جب سے ناصر کا کارخانے سے تعلق ختم ہوا تھا، انتظامیہ اسے رہائشی کیبن خالی کرنے پر زور دے رہی تھی مگر الکرامہ کا فلیٹ خالی نہیں تھا۔ ناصر انتظامیہ کے تقاضوں سے بچنے کے لیے بہت کم وقت اپنی رہائش گاہ پر گزارتا اور زیادہ تر وقت وہ فریدون خستہ تن کی دکان یا پھر مختلف شاپنگ مراکز میں گزارتا۔ ایک روز ایک شاپنگ مال میں اسے کیلاش اپنی 'بھوتنی' کے ساتھ نظر آیا۔ وہ اس سے بڑی گرم جوشی سے ملا، ''ہیلو ناصر، کیسے ہو؟'' اس نے خوش دلی سے کہا، پھر اپنی 'بھوتنی' کو ملایا، ''ان سے ملو، لتا ڈیسائی ہیں یہ، میری دوست، ایک انگریزی



اخبار میں کام کرتی ہیں۔''

''بہت خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' ناصر نے کہا، ''آپ رپورٹر ہیں؟''

''ہاں!'' لتا نے جواب دیا اور اپنے سر پر بالوں کے خوف ناک چھتے کو ہاتھوں سے سنوارا، ''میں شہری معاملات اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں کالم لکھتی ہوں۔''

''اچھا، تب ہی میں نے آپ کو ایک دن الف لیلہ تھیٹر میں دیکھا تھا۔'' ناصر بولا۔

لتا ہنسی، ''وہاں میں شاید کیلاش کی تلاش میں گئی ہوں گی، یہ وہاں پیانو بجاتے ہیں — اور آپ؟''

ناصر سے پہلے کیلاش بول پڑا، ''یہ مرجینا کے دوست ہیں۔''

''اچھا، وہ فلسطینی لڑکی —؟'' لتا نے پوچھا۔

''ہاں وہی جو چوروں کے ساتھ رہتی ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

''ہاہا، چوروں کے ساتھ، خوب کہا۔'' لتا نے قہقہہ لگایا اور کیلاش کی طرف دیکھ کے بولی، ''وہ کیا ہم سب چوروں کے ساتھ رہتے ہیں، یہ دنیا ہے ہی چوروں کا اڈّہ۔ کوئی چھوٹا چور کوئی بڑا۔ آؤ اب اسٹار بکس میں کافی پیتے ہیں، گرما گرم۔''

ناصر نے معذرت کی، آپ لوگ پییں، مجھے ذرا جلدی ہے، کافی ادھار رہی۔''

''اچھا تو پھر ملتے رہنا۔'' لتا نے کہا، ''چوروں کے بارے میں باقی باتیں اگلی ملاقات میں۔''

اچانک کیلاش نے کہا، ''ارے ٹھہرو! ایک دعوت نامہ ہے تمھارے لیے۔'' پھر اس نے بیگ میں سے ایک کارڈ نکالا، تم کراچی کے ہو، لہٰذا تمھارا آنا ضروری ہے۔'' اس نے دعوت نامہ ناصر کے حوالے کیا۔ سندھی ادبی سنگت کی جانب سے ایک تقریب کا بلاوا تھا جو ایسٹوریا ہوٹل میں 'مہراج موج' کے نام سے ہونے والی تھی، سندھی ثقافت کی شام!

ناصر کو اسی شام پتا چلا کہ الکرامہ میں اس کا فلیٹ خالی ہوگیا ہے۔ اس نے فوراً ٹیکسی پکڑی اور کارخانے سے اپنا سامان اٹھا کے نئے گھر میں منتقل ہوگیا۔ نئے گھر کی خوبی یہ تھی کہ فلیٹ کے نیچے ہی بازار تھا، کھانے پینے اور خرید و فروخت کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ کراچی دربار ریستوراں تو عین اس کے فلیٹ کے سامنے تھا۔

فلیٹ خالی تو ہو گیا تھا مگر ابھی اس میں تھوڑی سی صفائی کی ضرورت تھی۔ بستر، کپڑوں کی الماری، لکھنے کی میز، کرسی اور کچن میں فریج، چولھا ہر چیز موجود تھی۔ پہلے اس نے ایک طوفانی صفائی کی مہم میں فلیٹ کو بالکل چمکا دیا، کپڑے الماری میں رکھے اور دیگر چیزیں ترتیب سے سجائیں۔ کچھ پرانے اخبارات ایک کونے میں پڑے تھے۔ اس نے سوچا کہ انھیں اٹھا کے کچن میں رکھ آئے۔ وہ اخبار اٹھانے لگا اور اس کی نظر اس پرانے اخبار پر پڑی جس میں پروفیسر عظمت علی کے بارے میں خبر تصویر کے ساتھ سیاہ چوکھٹے میں چھپی ہوئی تھی۔ اسے اچانک کچھ یاد آیا۔ کام ختم کرکے اس نے اپنے بیگ میں سے پروفیسر عظمت علی کی کتاب نکالی اور بستر پر لیٹ گیا، جہاں تک اس نے کتاب پڑھی تھی، اس کے آگے کا صفحہ کتے کے کان کی طرح مڑا ہوا تھا۔ اس نے آگے پڑھنا شروع کیا۔



## ۱۷

# ترجمے کے مسائل

دور پہاڑیوں پر دھوپ پسپا ہو رہی تھی اور سپر ہائی وے پر شام کا دھندلکا پیش قدمی کر رہا تھا۔ سائیں راول ہوٹل پر بیٹھا سچل سرمست کی ایک کافی گنگنا رہا تھا۔ اتنے میں ایک بس آ کے رُکی۔ مسافر اترے اور اس کے ہوٹل کے سامنے مونڈھوں پر بیٹھ گئے لیکن ان کے چہروں پر تفکر اور تشویش کی پرچھائیاں تھیں۔ وہ سہمے سہمے سے لگ رہے تھے۔ سائیں راول نے ان کے آگے چائے کے کپ چن دیے۔ دو مسافر آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے، ''کل صبح سے شاید بسیں اور ویگنیں بند ہو جائیں۔''

سائیں راول چونکا، ''کیوں؟''

مسافر نے کہا، ''تمھیں معلوم نہیں، حیدرآباد شہر میں بڑا ہنگامہ ہے، آج لڑکوں نے بہت سی بسیں روک لیں۔ شہر اور اس کے آس پاس بڑی گڑبڑ ہے، سنا ہے کہ پولیس سے تصادم بھی ہوا ہے!''

''مگر کیوں؟'' سائیں راول نے پوچھا۔

مسافر اکتا کے بولا، ''کچھ اردو سندھی کا جھگڑا ہے۔''

سائیں راول خاموشی سے برتن سمیٹتا رہا۔ ذرا دیر میں میدان صاف ہو گیا اور بس

اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔

دوسرے دن سپر ہائی وے پر ٹریفک تقریباً بند رہا۔ کبھی کبھی کوئی اکا دکا موٹر کار یا کوئی فوجی گاڑی بے نیازانہ فراٹے بھرتی گزر جاتی۔ دوپہر میں ایک لمبی سی بس کراچی سے آئی، اس کے آگے ایک بینر لگا ہوا تھا جس پر لکھا تھا، ”کاروانِ اردو۔“ اس پر بہت سے لڑکے سوار تھے جو اردو کے حق میں نعرے لگا رہے تھے۔ ان میں سے ایک بڑے بڑے بالوں والا لڑکا گٹار بجا رہا تھا جس کی دھن کچھ یوں تھی، ”اردو میری جان، اردو پاکستان۔“ پھر کچھ لڑکے بس کی چھت پر چڑھ گئے اور ٹوئسٹ کرنے لگے۔ ”کاروانِ اردو“ رخصت ہوا تو ”ماروی میل“ آیا اور اس میں سے بہت سے لڑکے اجرک لپیٹے اور شیشے کے کام والی شکارپوری ٹوپیاں پہنے اترے۔ وہ دیر تک سائیں راول کے ہوٹل کے سامنے ”ہو جمالو“ رقص کرتے رہے۔ پھر کچھ نوجوان سائیں راول کے پاس آئے اور کہنے لگے، ”ہمیں آپ کے ہوٹل کا سائن بورڈ چاہیے۔“

”کیوں؟“ سائیں راول نے پوچھا۔

لڑکوں نے کہا، ”ہم یہاں ہر بورڈ، ہر تحریر سندھی میں دیکھنا چاہتے ہیں، ’کیفے راہ گزر‘ ثقیل نام ہے، یہ ہم سے ہضم نہیں ہوگا۔“

سائیں راول نے پوچھا، ”پھر کیا نام ہونا چاہیے؟“

لڑکوں نے کہا، ”اس کے آسان سندھی ترجمے کے لیے آپ ہماری خدمات حاصل کیجیے، بالکل مفت۔“ پھر کچھ لڑکوں نے میز پر چڑھ کے سائن بورڈ اتارا اور اس پر سفید رنگ پھیر دیا۔ اس کے بعد انھوں نے ’کیفے راہ گزر‘ کی جگہ جلی حروف میں لکھا— ’رستے جو چائے خانو!‘ اس کام سے فارغ ہو کے انھوں نے ”رستے جو چائے خانو“ میں ایک ایک کپ مفت چائے پی اور شکریہ ادا کرکے اپنی راہ لی۔

ابھی شام ہونے میں کچھ دیر باقی تھی کہ سائیں راول کو دور سے ناصر کی سفید ٹورسٹ وین آتی نظر آئی۔ گاڑی قریب آئی تو سائیں راول نے دیکھا اس کے شیشے ٹوٹے ہوئے تھے اور جگہ جگہ پتھروں کے نشانات تھے۔ گاڑی پر لکھے ہوئے سارے انگریزی لفظ کھرچ دیے



گئے تھے اور سامنے کی تختی اردو میں منتقل کردی گئی تھی۔ ناصر انجن بند کرکے گاڑی سے اترا تو سائیں راول نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خون کے چھینٹے تھے اور سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔

”یہ کیا ہوا؟“ سائیں راول نے گھبرا کے پوچھا۔

”ترجمے کے مسائل ہیں یہ!“ ناصر مسکرا کے بولا، ”میں اردو کا شہید ہوں۔“ اردو کے حامیوں اور پولیس کے درمیان پھنس تھا، آنسو گیس کے بادلوں اور پتھروں کی بارش سے گزر کے آ رہا ہوں۔“

سائیں راول نے کہا، ”معلوم ہوتا ہے تمھارے سر میں کافی چوٹ آئی ہے۔ میں کہتا ہوں آج یہیں ٹھہر جاؤ، دو چار مسافر جو ہیں انھیں کسی اور گاڑی سے چلتا کرو۔“

ناصر نے کہا، ”نہیں نہیں چاچا، فکر کرنے کی ضرورت نہیں، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ چلتے ہوئے اس نے ہوٹل پر لگے ہوئے سائن بورڈ پر نظر ڈالی جس پر اب ”رستے جو چائے خانو“ لکھا ہوا تھا۔

”یہ نیا نام ہے؟“ اس نے پوچھا

سائیں راول مسکرایا، بولا، ”بس مجھے چوٹ نہیں آئی۔“

ناصر ہنس پڑا، پھر اس نے گاڑی کے انجن کو چابی سے جگایا اور آگے بڑھ گیا۔

ایک دن صبح ہی صبح جب سائیں راول ہوٹل کی صفائی میں مصروف تھا، ایک جیپ آ کے رُکی اور اس میں سے ادا قادر بخش کھوسو اپنی پرانی شان سے برآمد ہوا۔ وہی اونچا سا ریشمی صافہ، چرمراتے ہوئے جوتے، آنکھوں میں سرمہ اور کاندھے پر چم چم کرتی کلھاڑی۔

”آؤ آؤ قادر بخش۔“ سائیں راول نے آگے بڑھ کے اس کا استقبال کیا۔ قادر بخش کھوسو سائیں راول سے بغل گیر ہوگیا اسی محبت بھرے انداز میں جسے سندھی میں بھاکر پانا کہتے ہیں۔ پھر وہ ایک مونڈھے پر ڈھیر ہوگیا۔

”لو بھئی۔“ اس نے کہا، ”میں اپنے وعدے کے مطابق پھر آ گیا ہوں— تمھارا فیصلہ سننے۔“

سائیں راول نے کہا، ”چلو وہ سب باتیں بھی ہوں گی، ابھی آرام سے تو بیٹھو—

کہو اچھے تو ہو، اتنے دن کیا کرتے رہے؟"

قادر بخش کھوسو نے کہا، "کیا کرتا — صبر کرتا رہا، پھر میں نے سوچا، اب بہت دن ہوگئے ہیں، پوچھوں کہ تمھارا کیا فیصلہ ہے۔"

سائیں راول لمحے بھر کو چپ رہا تو قادر بخش کھوسو نے پھر کہا، "آخر اب تو تمھیں نوری کے بارے میں کوئی نہ کوئی فیصلہ تو کر ہی لینا چاہیے — تم تو عقل مند آدمی ہو۔"

سائیں راول نے جواب دیا، "یار مشکل یہ ہے کہ جب لڑکی شادی کے قابل ہوجائے تو باپ کی عقل جواب دے جاتی ہے، خیر تم بیٹھو، چائے شائے پیو، ہم اس مسئلے پر بھی بات کریں گے۔"

اسی وقت ایک نیلی ٹورسٹ ویگن آ کے رُکی اور سائیں راول قادر بخش کھوسو کے پاس سے ہٹ کے ذرا دیر کو برابر والے کاؤنٹر پر مسافروں کو چائے دینے چلا گیا۔ وہ مسافروں کو چائے پلا کے فارغ ہوا تو اس نے قادر بخش کھوسو سے جو مونڈھے پر بیٹھا چرس کے سونٹے لگا رہا تھا، پوچھا، "تمھارے وڈیرے کی آمدنی کیا ہوگی؟"

قادر بخش کھوسو نے قہقہہ لگایا، "آمدنی؟ یہ سوال ہی غلط ہے، یہ پوچھو کہ اس کا خرچ کتنا ہے؟"

"اچھا —" سائیں راول مسکرایا، "خرچ کتنا ہے؟"

قادر بخش کھوسو نے پوچھا، "روزانہ یا ماہوار؟"

سائیں راول نے کہا، "ماہانہ بتاؤ؟"

قادر بخش کھوسو نے ہنس کر جواب دیا، "اتنا کہ تمھارا بوڑھا دماغ سوچ بھی نہیں سکتا، یہ سمجھو کہ جتنا تم سال بھر میں کماتے ہو اتنا تو وہ آدھے دن میں خرچ کردیتا ہے۔"

سائیں راول نے پوچھا، "اور عورتیں کتنی ہیں اس کے پاس؟"

قادر بخش کھوسو نے کہا، "باقاعدہ تو کوئی نہیں؟"

سائیں راول سراپا سوال بن گیا، "اور بے قاعدہ؟"

قادر بخش کھوسو جھینپ کے بولا، "چھوڑو یار، وڈیروں کے اعمال کا حساب کون دے



ملتا ہے۔ بس اس کی میں گارنٹی دیتا ہوں کہ نوری وہاں بہت خوش رہے گی۔"

سائیں راول جواب میں ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ ایک زوردار دھماکا ہوا۔ اس نے چونک کے دیکھا، ٹورسٹ ویگن کا ٹائر پھٹ گیا تھا۔ مسافر جلدی جلدی گاڑی سے اترے۔ ڈرائیور نے لپک کے ٹائر کی طرف دیکھا۔ پہیہ اتنا گرم تھا کہ اس میں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

ڈرائیور نے کہا، "یہ تو بڑی گڑبڑ ہوئی، اب کافی دیر ہوجائے گی۔"

ایک بوڑھے کسان نے آگے بڑھ کے پوچھا، "کتنی دیر ادا؟"

ڈرائیور بولا، "کم از کم ایک گھنٹا تو ضرور لگے گا۔"

بوڑھا گھبرا گیا، "ادا وری ہم تو مرجاؤں گا۔ ہماری عورت گردے کے سور سے مرتا ہے، اس کو اسپتال کیسے لے جاؤں میں؟"

ڈرائیور نے ٹھنڈا سانس بھر کے کاندھے اُچکائے، "مجبوری ہے سائیں!" یہ کہہ کر وہ ڈگی میں سے جیک نکالنے لگا۔ سارے مسافر گاڑی سے اتر گئے۔ بوڑھے کسان نے سہارا دے کر اپنی بیوی کو نیچے اتارا جو گردوں کے درد سے بے چین تھی۔ وہ زمین پر بیٹھ گئی۔ بوڑھا بے بسی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سائیں راول نے کہا، "بڑھیا کو زمین پر نہ بٹھاؤ، تم لوگ یہاں آ کے مونڈھوں پر بیٹھ جاؤ۔"

بوڑھے نے بڑی بی کو سہارا دے کر اٹھایا اور ہوٹل کے سامنے ایک مونڈھے پر لا بٹھایا۔ درد کی شدت سے بڑھیا کا چہرہ سفید ہو رہا تھا اور آنکھیں مندی ہوئی تھیں۔

سائیں راول نے کہا، "تمھاری گاڑی ٹھیک ہونے میں شاید کچھ دیر لگے تم کسی اور ویگن یا بس میں کراچی چلے جاؤ — تمھاری بیوی کو فوراً ڈاکٹر کے پاس پہنچنا چاہیے۔"

چند لمحوں بعد ہارن بجا اور ناصر کی سفید ٹورسٹ وین تیزی سے آ کے رکی۔ سائیں راول نے آگے بڑھ کے پوچھا، "کہو کراچی جا رہے ہو نا؟"

ناصر گاڑی سے اترا، "ہاں کیا بات ہے؟"

سائیں راول نے کہا، ''ایک کام ہے۔'' اس نے بوڑھے کی طرف اشارہ کیا، ''ان بڑے میاں کی بیوی سخت بیمار ہیں اور انھیں فوراً کراچی پہنچنا ہے مگر ان کی گاڑی خراب ہوگئی ہے، تم انھیں اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتے؟''

ناصر نے کہا، ''مگر میرے یہاں تو بالکل جگہ نہیں، سب سیٹیں گھری ہوئی ہیں۔''

سائیں راول نے کہا، ''کوئی ترکیب نکالو، بے چارے لوگ بہت پریشان ہیں۔''

ناصر نے ایک نظر درد سے تڑپتی بڑھیا کو دیکھا جو مونڈھے پر بیٹھی جھوم رہی تھی اور پھر بوڑھے کسان کے گھبرائے ہوئے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس نے کہا، اچھا کوشش کرتا ہوں، اگر کوئی دو مسافر انھیں اپنی جگہ دینے کو تیار ہوگئے تو میں انھیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔''

ناصر نے گاڑی کے پاس جا کے مسافروں سے بات چیت کی مگر کوئی شخص بوڑھے کسان اور ان کی بیمار بیوی کے لیے اپنی جگہیں خالی کرنے پر رضامند نہ ہوا۔ ناصر نے سب کو غور سے دیکھا۔ آخری دو سیٹوں پر دو کرم خوردہ سے آدمی بیٹھے ہوئے تھے۔ ناصر نے کہا، ''بہتر ہوگا کہ آپ دونوں اگلی گاڑی سے آجائیں اور مجھے ان دونوں کو ساتھ لے جانے دیں۔''

جس گاڑی کا ٹائر پھٹ گیا تھا اس کے ڈرائیور نے بھی دونوں مسافروں سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ جاسکتے ہیں مگر وہ راضی نہیں ہوئے۔ ناصر نے ایک بار پھر کہا، ''مجھے اس بوڑھے اور اس کی بیمار بیوی کو لے جانے دیں، مہربانی ہوگی۔''

''نہ نہ بھائی، اپن کو یہ منظور نہیں۔'' انھوں نے اپنے میلے دانت دکھائے۔ ناصر کو غصہ آگیا اور اس نے کہا، ''مگر مجھے منظور ہے، آپ فوراً سیٹیں خالی کردیں ورنہ میں زبردستی کروں گا، آخر انسانیت بھی کوئی چیز ہے۔'' ناصر نے آنکھیں دکھائیں تو وہ ڈر گئے اور بڑبڑاتے ہوئے اپنا سامان اٹھا کے گاڑی سے نیچے اتر آئے۔ ان میں سے ایک مسافر بے حد چراغ پا تھا۔ وہ چیخ کر بولا، ''یاد رکھنا میں کراچی پہنچ کے تم سے نمٹ لوں گا، ذلیل آدمی۔''

ناصر نے کہا، ''شوق سے۔'' اور بوڑھے کسان اور اس کی بیوی کو سہارا دے کر اپنی وین میں بٹھانے لگا۔ ناراض مسافر پھر چیخا، ''ہمارے پیسے واپس کرو بے ایمان کے بچے، دیکھنا میں تمھارا کیا حشر کرتا ہوں۔'' ناصر نے انھیں کرائے کی رقم واپس کرتے ہوئے خوش



مزاجی سے کہا، ''آپ کا شکریہ جناب۔''

مسافر نے نوٹ چھینتے ہوئے غصے سے کہا، ''فکر مت کرو میں کراچی پہنچتے ہی تمھیں نوکری سے نکلوا دوں گا۔'' تمھاری کمپنی کا مالک میرا دوست ہے۔ ساری دادا گیری نکل جائے گی۔''

ناصر مسکرایا، ''آپ کو اس کی پوری اجازت ہے، یہ شوق ضرور پورا کیجیے گا، ٹاٹا۔'' اس نے گاڑی آگے بڑھائی۔ دونوں مسافر پاؤں پٹختے ہوئے سائیں راول کے ہوٹل میں آبیٹھے۔ وہ دانت پیس پیس کے ناصر کو کوس رہے تھے۔ سائیں راول نے ان کی طرف چائے کے کپ سرکاتے ہوئے کہا، ''غصہ تھوک دیں جناب، وہ بڑا اچھا لڑکا ہے۔''

''ہونہہ۔'' ان میں سے ایک بولا، ''اس کی ایسی کی تیسی۔'' مارے غصے کے اس کا چہرہ عنابی ہو رہا تھا۔

قادر بخش کھوسو جو دور بیٹھا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا، قریب آیا، ''کیا بات ہے راول؟''

سائیں راول ہنسا، ''کچھ نہیں، یہ ناصر پر ناراض ہو رہے تھے، میں انھیں سمجھا رہا تھا۔''

قادر بخش کھوسو نے پوچھا، ''ناصر کیر — ہو چھوکرو؟'' (ناصر کون، وہ لڑکا؟)

سائیں راول نے جواب دیا، ''وہاں وہی، بہت نڈر لڑکا ہے۔''

قادر بخش کھوسو نے اکتا کے کہا، ''خیر اسے چھوڑو، کام کی بات کرو، تم نے آخر کیا سوچا، وڈیرہ زیادہ انتظار نہیں کرسکتا۔''

سائیں راول ایک دم سے اپنی دنیا میں واپس آگیا جہاں وہ ایک بیٹی کا باپ اور ایک مجبور آدمی تھا، وڈیرے کے حکم کو ٹالنے کی ہمت نہ رکھنے والا۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا مگر پھر اچانک جیسے کسی خواب سے جاگ کے بولا، ''سنو دوست مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری خواہش پوری نہیں کرسکتا، تم وڈیرے سے کہہ دو کہ وہ انتظار نہ کرے۔'' قادر بخش کھوسو ٹپٹا کے رہ گیا، شاید اسے اس جواب کی توقع نہ تھی۔

اس نے کہا، ''سائیں راول ایک بار پھر سوچ لو، یہ موقع پھر نہیں آئے گا۔''

سائیں راول نے سرد مہری سے جواب دیا، ''میں بار بار فیصلے نہیں بدلتا قادر بخش، تمھارے وڈیرے کو اور بہت سی بیویاں مل سکتی ہیں، مجھے اپنی بیٹی دوبارہ نہیں مل سکتی۔''

قادر بخش کھوسو کچھ دیر چپ رہا، پھر اس کے بعد اتنا کہا، ”تم نے جلد بازی سے کام لیا۔“ اس کے بعد اس نے جلدی جلدی اپنی چیزیں سمیٹیں اور خاموشی سے رخصت ہوگیا۔

سائیں راول اس کے جانے کے بعد اندر گیا تو نوری کی سوالیہ نگاہیں اس کی منتظر تھیں، ”کون آیا تھا بابا؟“

”ایک ملنے والا تھا بیٹی!“ سائیں راول نے دھیرے سے کہا، پھر وہ جیسے خود سے بولا، ”عمر کوٹ اب بھی موجود ہے مگر ___“

---

شام کو چراغ جل چکے تھے۔ سپر ہائی وے پر اندھیرے کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ سائیں راول گھر میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا کہ اسے کسی نے پکارا۔ سائیں راول نے جلدی جلدی ہاتھ دھوئے اور باہر نکلا۔ ہوٹل کی چھت سے لٹکتے ہوئے پیٹرومیکس کی روشنی میں اس نے دیکھا کاؤنٹر کے پاس کوئی کھڑا تھا۔

”کون ہے؟“ سائیں راول نے پوچھا۔

”میں ہوں ناصر۔“ جواب آیا۔ سائیں راول آگے بڑھا تو ناصر بھی روشنی میں آگیا۔ اس کا شیو بڑھا ہوا تھا اور کپڑوں میں سلوٹیں تھیں۔ بال بے ترتیب تھے۔ وہ چہرے سے تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ سائیں راول ٹھٹک گیا، ”ارے ناصر! کیا ہوا، یہ تمھارا حلیہ کیسا ہے، کیا بات ہے؟“

ناصر مونڈھے پر بیٹھ گیا اور کمزور سی آواز میں بولا، ”کل کا واقعہ یاد ہے، انھوں نے مجھے سچ مچ نوکری سے نکلوا دیا ___ خیر!“

سائیں راول چند لمحوں کے لیے سکتے میں رہ گیا پھر ہنس کے بولا، ”تو کیا ہوا، یہ تو کوئی پریشانی کی بات نہیں دوست! یہ تمھارا ہوٹل جو ہے، ہم دونوں اسے مل کے چلائیں گے۔ میں بھی اکیلا ہوں اور پھر بوڑھا، اس پر نوری کی جوانی کا بوجھ، مجھے تجھ پر اعتبار ہے، اور تیرے مضبوط بازو میرا سہارا بن سکتے ہیں۔“

ناصر خوشی سے ناچ گیا، ”سائیں راول میں تیرا احسان نہیں چکا سکتا۔“ پھر اس نے سندھی میں کہا، ”سائیں راول تو ڈاڈھو سٹھو ماڑھوں آہے۔“



سائیں راول بولا، ”بس زیادہ تعریف نہیں، ورنہ میں بوڑھا آدمی کہیں خوشی سے مر ہی جاؤں، اچھا اب کھانا کھاؤ اور آرام کرو، میں تمھارے لیے چارپائی بچھاتا ہوں۔“

کھانے سے فارغ ہو کے جب ناصر لیٹنے لگا تو سائیں راول نے اسے اندر سے ایک رنگ برنگی رلّی لا کے اوڑھنے کے لیے دی۔ ناصر بستر پر لیٹے لیٹے دور تک اندھیرے میں لپٹی ہوئی سپر ہائی وے کو دیکھتا رہا جس پر بہت سارے جگنو اُڑ رہے تھے۔ اس نے رلّی اوڑھ لی اور نہایت لطیف اور سرور آگیں مہک اس کے پورے وجود میں سرایت کر گئی۔ رلّی کے لال، پیلے اور گلابی تکونے تراشے اسے پھولوں کی پنکھڑیوں کی طرح آپس میں گتھے ہوئے نظر آئے۔ پھر اس نے عجیب خواب دیکھا کہ جیسے پوری سپر ہائی وے سمٹ کے اس کی چارپائی کے نیچے آگئی ہے اور اس کے سرہانے پیپتے کا بڑا سا پیڑ اُگ آیا ہے اور جہاں اس کے پاؤں ہیں، وہاں کھجور کا اونچا سا درخت ہے اور دونوں درخت جھک کے ایک دوسرے کو چھو رہے ہیں۔ وہ لیٹا مسکراتا رہا۔



# ۱۸

# مہران موج

ناصر نے اندر قدم رکھا تو الغوزے کی مدھر دھنوں نے کسی مانوس خوش بو کی طرح اس کے پورے وجود کو مہکا دیا۔ فضا میں سندھی سُر اور سنگیت کے پرچم لہرا رہے تھے۔ الغوزے، اکتارے، تانپورے، چنگ و رباب — کافیاں، وائیاں، ڈھولے اور بھجن — خمیسو خان، استاد جمعہ خان، مائی بھاگی، روبینہ مصطفیٰ، عابدہ پروین، الّن فقیر، گھنشیام واسوانی اور مہیش چندر سے لے کر شازیہ خشک اور صنم ماروی تک کے سندھی راگ اور راگنیوں کے خوش رنگ پھول کھلے ہوئے تھے۔

ایسٹوریا ہوٹل کے لاؤنج میں سندھی دستکاریاں، سندھی کتابیں اور سندھی موسیقاروں اور گائیکوں کے کیسٹ، لانگ پلے ریکارڈ اور آڈیو اور وڈیو البم بک رہے تھے۔ دیواروں کو قدِ آدم پوسٹروں اور خوب صورت تصویروں سے سجایا گیا تھا، جن میں سندھ کی مشہور یادگار عمارتیں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں۔ سادھو بیلا کا مندر، ٹھٹھے کی مسجد، سیہون میں شہباز قلندر کا مزار، سچل سرمست کا مقبرہ، سکھر کا مینارۂ معصوم شاہ، روہڑی کا پل اور سات سہیلیوں کا آستانہ، مکلی کا قبرستان اور کراچی کا فریئر ہال سب وہاں موجود تھے۔

ناصر نے مختلف اسٹالوں کا چکر لگایا پھر ہال کے اندر چلا گیا جہاں ادبی جلسے کا آغاز





ہونے والا تھا۔ 'مہران موج' کے نام سے سندھی تہذیب و ثقافت کا یہ دن سندھی ادبی سنگت کی طرف سے منایا جا رہا تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا مگر تقریب ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ناصر ہال کی دیواروں پر لگی مشاہیر کی تصاویر دیکھنے لگا۔ ان میں سب ہی شامل تھے۔ شاعر اور صوفی، محقق اور ادیب — اگر ایک طرف شاہ عبداللطیف بھٹائی تھے تو دوسری طرف مرزا قلیچ بیگ، ڈاکٹر گربخشانی، پروفیسر جھٹ مل، سوبھو گیان چندانی، پیر حسام الدین راشدی اور بہت سے دوسرے! اچانک کسی نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کیا اور کہا، "رگ وید میں لکھا ہے کہ اے سندھو! ورن دیوتا نے تیرے بہاؤ کے کئی راستے بنائے ہیں — اور اس تصویر والے شخص نے اعلان کیا کہ ان میں سے ایک راستہ اس کی شاعری ہے۔ اور جانتے ہو یہ شاعر کون ہے، شیخ ایاز — جان لو اس کو کیوں کہ جو اس کو نہیں جانتا، وہ سندھو دریا کو نہیں جانتا۔"

ناصر نے پوچھا، "آپ انھیں کیسے جانتے ہیں؟"

اس شخص نے کہا، "وہ میرے شہر کے رہنے والے تھے، سکھر کے، اور سندھو دریا ان کے گھر کے پچھواڑے بہتا تھا۔"

ناصر نے پوچھا، "اور آپ کون؟"

اس شخص نے کہا، "ان کا ایک پرستار۔" اور اس سے پہلے کہ ناصر کچھ اور پوچھتا، وہ شخص لوگوں کے ہجوم میں گم ہو گیا۔

اچانک ناصر کی نظر کیلاش رام چندانی پر پڑی۔ اس نے ہاتھ ہلا کے اسے اپنی طرف بلایا۔ وہ اگلی نشستوں پر بیٹھے کچھ لوگوں سے باتیں کر رہا تھا، "ان سے ملو یہ ہیں مشہور شاعر اور ادیب ڈاکٹر موتی پرکاش، ان کی بیگم اور ان کی بیٹی — پورا گھرانا ہی لیکھکوں کا ہے۔" کیلاش نے کہا۔ اسی وقت جلسہ شروع ہو گیا اور اسٹیج سیکریٹری نے مہمانِ خصوصی ڈاکٹر روپ چند پروانی سے ڈائس پر آنے کی درخواست کی۔ اسٹیج سیکریٹری نے اعلان کیا کہ مہمانِ خصوصی جو بین الاقوامی سندھی کلچرل کانگریس کے سربراہ ہیں، تقریب کے بارے میں اظہارِ خیال کریں گے۔ ڈاکٹر روپ چند پروانی نے بتایا کہ اس تقریب کا مقصد دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سندھیوں کو اُس عظیم الشان تہذیب کی اہمیت سے آگاہ کرنا ہے جس نے دریائے سندھ کی

وادی میں بنی نوعِ انسان کو شائستگی اور امن و آشتی کا سبق دیا تھا۔

"آج ہم میں سے بہت سے لوگ سندھ سے باہر ہیں مگر سندھ ہمارے اندر ہے اور سندھو سائیں آج بھی ہماری روح کے اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے۔" انھوں نے کہا۔ اسی وقت لتا ڈیسائی نے جو ناصر کے برابر والی نشست پر بیٹھی تھی، اس کا ہاتھ دبایا — "تم نے باہر دیکھا، شیشے کے بڑے سے مرتبان میں دریائے سندھ کا پانی بھی موجود ہے، جو چاہے اسے پیے اور روحانی تسکین حاصل کرے۔"

مہمانِ خصوصی کی تقریر ختم ہوئی تو ایک شاعر نے دریائے سندھ کے بارے میں اپنا گیت سنانا شروع کیا۔ گیت بہت خوب صورت تھا اور اس میں دریا کو ایک دلھن سے تشبیہ دی گئی تھی اور کہا گیا تھا کہ جب رات میں دریا کے سینے پر ستاروں کا عکس جھلملاتا ہے اور ہلالی چاند اس کی لہروں میں ڈولتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے کوئی دلھن ستاروں کی چادر اوڑھے اور ناک میں چاند کی نتھ پہنے اپنے دولھا کے انتظار میں ہو۔"

"واہ، واہ— کیا اچھی بات کہی ہے۔" لتا بولی، "میں نے تو اب تک دریا کو دولھا کے روپ میں ہی دیکھا تھا جو بستیوں کو سیراب کرتا ان کی کوکھ میں شادابی کے بیج بوتا چلا جاتا ہے اور کبھی نہیں تھکتا۔"

"اور کبھی نہیں سوتا۔" کیلاش نے لقمہ دیا، "ایک سرائیکی کوی ڈاکٹر اشو لال نے اپنی نظم 'ساگر نال ہمیشاں' میں یہی بات کہی ہے:

کوئی دیوتا ہئی جیہڑا سمدا نئیں

یعنی کوئی دیوتا ہے جو سوتا نہیں۔"

"بے شک!" ناصر نے کہا، "وہ دیوتا ہی کیا جو کسی وقت سو جائے۔"

اتنے میں ایک خاتون کہانی کار نے اپنی کہانی پڑھنا شروع کی جو ان لوگوں کے بارے میں تھی جو دریا سے دور دکھوں کے صحرا میں اپنے دن کاٹ رہے ہیں۔ کہانی مکمل ہوئی اور تالیاں بجیں۔ اچانک اس شخص نے جو کچھ دیر پہلے شیخ ایاز کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کر رہا تھا، اپنی کرسی سے کھڑے ہو کے کہا، "یہ دل دوز افسانہ سن کے مجھے تلوک چند محروم



کا وہ شعر یاد آ گیا جو ان کی "آبِ سندھ" نامی نظم میں شامل ہے:

ہر موجِ آبِ سندھ ہوئی وقفِ پیچ و تاب
محروم جب وطن میں ہماری خبر گئی

پھر اس نے کہا، "لیکن اگر آپ سندھو دریا کے فراق میں مبتلا ہیں تو بھلا سادھو بیلا کے اس مندر کو کیسے بھلا سکتے ہیں جس کے چرنوں کو چھوئے بغیر دریا کی لہریں آگے نہیں بڑھتیں، اگر آپ اجازت دیں تو میں اس کے بارے میں ایک نظم پیش کروں جو سکھر کے ایک گم نام شاعر مسعود عظیم کی تخلیق ہے۔"

"ضرور، ضرور۔" لوگوں نے ہاتھ ہلائے۔

اس شخص نے نظم پڑھنا شروع کی۔ اس کا عنوان تھا، "سادھو بیلا۔"

سینۂ آبِ رواں پر دیوتاؤں کا جلال
نوحہ خواں، ماتم کناں، فریاد رس، غرقِ خیال
بے خبر از شورشِ مستقبل و ماضی و حال
سندھ کے دریا کے سینے کا دھڑکتا دل ہے تو
سینۂ سیتا پہ لہرائی ہوئی کاکل ہے تو
رونقیں اب جس کو روتی ہیں وہی محفل ہے تو

گیت گاتی دیویاں، اشلوک پڑھتے برہمن
لہلہاتے غنچہ و گل، رقص فرماتے سمن
تیرے آگے ماند تھے غزنی و فارس کے چمن
یاد آتی ہیں تجھے کیا وہ برہمن زادیاں
بھول بھی سکتا ہے کیا تو وہ حسیں شہزادیاں
تیرے مندر میں تھیں جن کے دم سے کل آبادیاں

آہ اب کس دل سے دیکھوں تیری ویرانی کا حال
رقص کرتی ہے نحوست وحشتیں دیتی ہیں تال
کتنا عبرت خیز ہے تہذیبِ انساں کا مآل

پھر بھی تیرے حسن سے مسحور ہوجاتا ہے دل
اب بھی تیرے کیف سے مسحور ہوجاتا ہے دل
تجھ کو غمگیں دیکھ کے رنجور ہوجاتا ہے دل

سادھو بیلا تیرا مندر اب بھی ایستادہ تو ہے
دل تری توصیف کے نغموں پہ آمادہ تو ہے
اک دلِ شاعر سہی پر تیرا دل دادہ تو ہے

نظم مکمل ہونے کے بعد تالیوں کی گونج ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ کیلاش، ناصر اور لتا کے پاس آیا، ''آؤ باہر چلیں، زائرین میں سندھو کے پانی کی بڑی مانگ ہے، جو جھیل مان سرور سے لایا گیا ہے۔ چلو دیکھتے ہیں۔'' تینوں باہر آ گئے۔ عورتیں، مرد اور بچے ''سندھ ساگر'' کے مرتبان سے پانی نکال کے چمچوں سے پی رہے تھے۔

ناصر نے کہا، ''حیرت ہے، یہ کوئی زم زم ہے؟''

کیلاش بولا، ''ہمارے لیے تو زم زم ہی ہے، چاہے گنگا کا پانی ہو یا سندھو کا — سب دریا پوتر ہوتے ہیں، مقدس، پاک! اور پاک پانی پینے سے منش کی شکتی بڑھ جاتی ہے، تم نے ضرور سنا ہوگا، ہندی اور اردو کے ایک ادیب ہیں انل ٹھاکر، انھوں نے زم زم پیا اور افسانے لکھنے لگے۔''

ناصر بولا، ''کمال ہے، مگر بعض بڑے شاعروں اور ادیبوں کے بارے میں سنا ہے کہ وہ پانی پیتے ہی نہیں، صرف شراب پیتے ہیں۔'' لتا ہنسنے لگی۔

کیلاش ناراض ہوا، ''نہیں — میں اس معاملے میں بڑا کٹر دریا پرست ہوں۔ میری تو خواہش ہے کہ میں مر جاؤں تو میری راکھ سندھو دریا میں بہا دی جائے۔''

''گنگا میں کیوں نہیں؟'' ناصر نے چھیڑنے کو پوچھا۔

''اس لیے کہ جو دریا مرنے والے کی جنم بھومی کے پاس بہتا ہے، وہی اس کے خوابوں میں بسا رہتا ہے اور وہیں اس کی آتما بھی بھٹکتی رہتی ہے۔ یقیناً تمھارے یہاں بھی ایسے لوگ ہوں گے جو دن رات گنگا، جمنا اور گومتی کو یاد کرتے ہوں گے۔'' وہ بولا۔



''ہاں، مگر انھیں پتا ہے کہ وہاں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں جو ان کی اس حرکت پر انھیں قریب ترین دریا میں ڈبو دینے کو تیار رہتے ہیں۔'' ناصر نے کہا۔

اسی وقت برابر والے ہال میں موسیقی کی لہریں ابھرنے لگیں اور ہارمونیم، سارنگی اور اکتارے زندہ ہوگئے۔ پوری دنیا سے آئے ہوئے سندھی فن کار، وادیِ مہران کو سُر اور سنگیت کی سوغات پیش کر رہے تھے۔ عابدہ پروین کے وجد آور کنسرٹ کے بعد ڈاکٹر موتی پرکاش کے گیت ''آندھین میں جوت جگائن وارا'' پر گھنشام واسوانی اور ان کے ساتھیوں نے خوبصورت گروپ ڈانس پیش کیا پھر احمد مغل نے ''گلی گلی گھر گھر گونجن سندھ امر جا نعرہ'' سے سامعین میں بڑا جوش اور ولولہ پیدا کر دیا۔ آخر میں سب فن کاروں نے ساتھ مل کے سیہون کے مردِ قلندر کی شان میں اہلِ صفا کا نغمۂ مستانہ گانا شروع کیا اور ہال میں دھمال ڈالنے والوں کے گرد ''توں لال مری پت رکھیو بھلا، جھولے لالن، سندھڑی دا، سیہون دا، سخی شہباز قلندر، دما دم مست قلندر'' کے گیت اور نعرے دیر تک گونجتے رہے۔ ناچنے والوں میں بیجل اور راجا بھی شامل تھے۔

کنسرٹ ہال سے باہر نکلتے ہوئے اچانک شیخ ایاز کا پرستار اور سادھو بیلا کا دل دادہ ناصر سے ٹکرا گیا، ''آہا، خوب ملے — وہ جو سندھو دریا کے بہاؤ کے راستے والی بات تھی شیخ ایاز نے خود لکھی ہے اپنی شاعری کے بارے میں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''جی ہاں، بھئی وہ تو انتساب ہے اُن کی کتاب 'نیل کنٹھ اور نیل کے پتے' کا!'' وہ بولا۔

ناصر نے پوچھا، ''آپ نے اپنا نام نہیں بتایا؟''

''دلبر پاکستانی ہے میرا نام۔'' اس نے جواب دیا۔

''آپ بھی شاعر ہیں؟'' ناصر نے سوال کیا۔

''نہیں تو —'' اس نے کہا۔

''جب شاعر نہیں ہیں تو دلبر کیوں ہیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

''شکر ہے۔'' وہ ہنسا، ''آپ نے یہ نہیں پوچھا کہ پاکستانی کیوں ہیں حالانکہ آج کل کے حالات میں بہت سے لوگ یہ سوال بھی پوچھ سکتے ہیں، اس لیے میں نے پہلے سے اپنا

جواب سوچ رکھا ہے۔"

"اور وہ کیا ہے؟" ناصر نے دل چسپی لیتے ہوئے کہا۔

"دراصل میرے والد کا نام دلگیر عظیم آبادی تھا کیوں کہ وہ عظیم آباد کے رہنے والے تھے مگر میں تو کبھی عظیم آباد گیا ہی نہیں، پھر بھی مجھے لوگ ابھی تک عظیم آبادی ہی سمجھتے ہیں۔ لہٰذا میں نے اعلان کر رکھا ہے کہ میں پاکستانی ہوں۔"

ناصر کھلکھلا کے ہنسا، "یار مزے کے آدمی ہو اور تم نے اپنا تخلص بھی صحیح رکھا ہے دلبر، تم واقعی دلبر، دل دار، دل نواز اور دل پسند ہو میری رائے میں۔ ویسے تم شاعری کیوں نہیں کرتے اتنا اچھا تخلص ضائع جا رہا ہے!"

دلبر نے کہا، "شاعری کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ اگر شاعر کو یہ احساس ہو جائے کہ اس کا تخلص اچھا ہے تو وہ شاعری اچھی نہیں کر پاتا۔ ہمارے بہت سے شاعروں کا مسئلہ یہی ہے۔ اسی لیے اقبال نے الگ سے اپنا کوئی تخلص نہیں رکھا تھا، اس سے پتا چلتا ہے کہ اقبال فلسفی ہونے کے علاوہ نہایت عقل مند آدمی بھی تھے۔"

ناصر نے دلبر سے ہاتھ ملایا، "آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟"

"ایک اسکول میں پڑھاتا ہوں۔" اس نے جواب دیا۔

"کبھی کبھی ملتے رہا کیجیے۔" ناصر بولا۔

"کیوں نہیں۔" دلبر نے کہا، "کہیں نہ کہیں ٹکراؤ ضرور ہوگا، پرانا آوارہ گرد ہوں، لہٰذا مشاعروں، ادبی جلسوں، اسٹیج ڈراموں، مباحثوں، مناظروں اور گانے بجانے کی محفلوں میں ہر وقت جانے کو تیار رہتا ہوں، شرط یہی ہے کہ داخلہ مفت ہو۔"

ناصر ہوٹل سے باہر نکلا تو اس نے کیلاش کو لتا کے ساتھ ایک ٹیکسی میں بیٹھتے دیکھا۔ وہ مسکرایا اور قریبی بس اسٹاپ کی طرف بڑھ گیا۔

○

# ۱۹

# صحرائی طوفان

فریدون خستہ تن دکان میں اپنی گدی پر بیٹھا تھا۔ پاس ہی بجلی اور راجا بھی براجمان تھے۔ بڑی اہم میٹنگ ہو رہی تھی کیوں کہ اس میں ناصر کو اس کی نئی ذمے داریوں سے آگاہ کیا جا رہا تھا۔

"تمھارا آنا ہمارے کاروبار کے لیے مبارک ثابت ہوا ہے، اس لیے کہ تم جس دن سے ہم یہاں آئے ہو ہمارے، بیرونی آرڈر بڑھ گئے ہیں۔" خستہ تن نے کہا، "یہی وجہ ہے کہ پپی سنگھ بادل کے علاوہ سمندر خان کو بھی رکھ لیا گیا ہے جو سعودی عرب اور قطر مال پہنچائے گا۔ پپی سنگھ بادل اب صرف شام اور لبنان ٹرک لے کر جائے گا۔ عراق اور کویت میں تھوڑا امن ہو جائے تو وہاں کے لیے نیا ڈرائیور رکھیں گے۔"

"وہاں بھی امن ہو جائے گا ارباب۔" ناصر بولا، "صحرائی طوفان کویت میں موت کی شاہراہ سے گزر کے دجلہ و فرات کی وادیوں پر چھا گیا ہے۔"

ناصر کو بڑے گودام کا نگراں بنا دیا گیا تھا جہاں سے ہر ہفتے لاریاں مال کی پیٹیاں فولادی کنٹینرز میں لاد کے دوسرے ملکوں کے لیے روانہ ہوتی تھیں۔ ناصر گودام کے ایک کونے میں بنے ہوئے اپنے دفتر میں پہنچا تو وہاں پپی سنگھ بادل اور سمندر خان پہلے سے موجود تھے۔

پپی سنگھ بادل کے ٹریلر پر لدے ہوئے بڑے بڑے کنٹینرز میں مال کی پیٹیاں چڑھائی جا رہی تھیں، ان میں اخروٹ، چلغوزوں اور بادام کی پیٹیاں اور باسمتی چاول اور پسے ہوئے مصالحوں کے پیکٹ شامل تھے۔

ناصر نے پپی سنگھ بادل سے پوچھا، ''بڑا لمبا سفر ہوتا ہے تم لوگوں کا، راستے میں بڑی گرمی اور دھوپ ہوتی ہوگی، تم اکتاتے نہیں؟''

پپی سنگھ ہنسا، ''سر جی گرمی زیادہ ہو تو ہم رات کے وقت سفر کرتے ہیں مگر سڑکیں بہترین ہیں اور راستے میں ٹھہرنے کے لیے اچھے خاصے ہوٹل ہیں، لہٰذا زیادہ پریشانی نہیں ہوتی۔ سفر لمبا ضرور ہوتا ہے مگر پیسے بھی تو اسی کے ملتے ہیں، دلّی میں بھی یہی کام تھا مگر وہاں پیسے اتنے کب ملتے تھے۔''

''تم دلّی سے کب آئے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''اب تو بہت سال ہوگئے سر جی، بچے بھی بڑے ہوگئے ہوں گے، انھیں پٹیالہ میں چھوڑ کے آیا ہوں، پہلے سب دلّی میں رہتے تھے مگر اندرا جی کی ہتیا کے بعد وہاں سے بھاگنا پڑا، اس شام تو سکھوں کے لیے دلّی جہنم بن گیا تھا۔''

''بچوں سے ملنے جاتے ہو کبھی؟'' ناصر نے پوچھا۔

''جاتا ہوں، سال دو سال میں ایک بار، اپنے نئے بچے کی شکل دیکھنے۔'' وہ بے حیائی سے ہنسا۔

سمندر خان بھی ہنسا، ''اسی لیے میں نے تو اپنی عورت کو ساتھ رکھا ہے، شیخ حاتم ایک بار یہاں سے اپنے باز لے کر پرندوں کے شکار پر ادھر گئے تھے بس میں دن رات ان کے ساتھ رہا وہاں، بڑی خدمت کی، انھوں نے خوش ہو کے یہ مہربانی کی کہ مجھے اور میری بیوی دونوں کو یہاں آنے کا ویزا دے دیا۔''

اسی وقت پپی سنگھ بادل کو کسی نے آواز دی اور وہ اٹھ کے باہر چلا گیا۔

''تم لوگ خوش تو ہو یہاں؟'' ناصر نے سمندر خان سے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھا۔



''کیوں نہیں — '' سمندر خان بولا، ''پیسا ٹھیک ٹھاک ہے، کھانے کو بھی خوب ملتا ہے، بڑی شان دار مسجدیں ہیں، بس ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔''

''وہ کیا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہ لوگ گوری چمڑی والوں سے بہت مرعوب ہیں سر! ان کے لیے کوئی روک ٹوک نہیں، جیسے چاہے رہیں، جو چاہے کریں۔ اب دیکھیں نا، کیسی عجیب بات ہے — آپ نے برج العرب دیکھا ہے نا؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے ناصر کو ٹٹولا۔

''ہاں، کیوں نہیں، وہی نا دنیا کا سب سے اونچا ہوٹل۔'' ناصر نے کہا۔

''ہوٹل کا تو بہانہ ہے — '' سمندر خان نے اپنی مہندی کے خضاب سے رنگی ہوئی لال داڑھی پر ہاتھ پھیرا، ''اس کی آڑ میں کعبہ شریف کے رُخ پر دنیا کی سب سے بڑی صلیب بنائی ہے انھوں نے، ہزار فٹ سے زیادہ اونچی۔''

''نہیں سمندر خان۔'' ناصر نے کہا، ''ایسی تو کوئی بات نہیں، وہ تو ہیلی کاپٹر کے اترنے کا پلیٹ فارم ہے جو دور سے ایسا نظر آتا ہے۔''

''کچھ بھی ہو، مقصد تو پورا ہوگیا نا۔'' سمندر خان بولا، ''مگر اس میں شیخوں کا کوئی قصور نہیں، وہ تو سب کے سب پکے مسلمان اور اسلام کی سرپرستی کرنے والے ہیں۔ آپ دیکھیں کتنے بہت سے غیر مسلم یہاں آ کے مسلمان ہوگئے۔''

''اچھا — شاید ان کی دیکھ بھال اچھی ہوتی ہوگی یہاں۔'' ناصر بولا۔

''جی صاحب، جبھی تو ہندوستان میں بابری مسجد کو شہید کرنے والا شیو پرشاد بھی اب یہاں قابلِ تعریف نومسلموں کی صف میں شامل ہے، وہ نہ صرف سرکاری وظیفہ پا رہا ہے بلکہ اسے یہاں سرکار کی طرف سے رہنے کو جگہ بھی دی گئی تو ایک مسجد میں — سبحان اللہ۔''

ناصر نے اُکتا کے کہا، ''ضرور اس نے اپنے پچھلے جنم میں کچھ نیک کام کیے ہوں گے، خیر چھوڑو، تم بتاؤ سعودی عرب جانا تمھیں کیسا لگے گا مال لے کر؟''

''احسان ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا، جس نے اس پاک جگہ کی زیارت کے لیے مجھ جیسے گنہگار کو چنا — کل صبح میری روانگی ہے، میرا تو جی چاہتا ہے کہ کل کے بجائے آج ہی

روانہ ہوجاؤں۔'' سمندر خان کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔

نیجل اور راجا اپنی ذاتی نگرانی میں سمندر خان کے کنٹینر ٹرک پر خشک میوے کے کریٹ رکھوا رہے تھے۔ کام ختم ہوا تو ناصر گودام سے باہر نکلا اور ٹہلتا ہوا کھاڑی کی طرف چلا گیا جہاں کنارے پر قطار میں کھڑی بڑی بڑی کشتیوں میں سے مال اتارا یا ان پر مال چڑھایا جا رہا تھا۔ ان میں سے کچھ کشتیاں ایرانی اور کچھ افریقی اور ہندوستانی بندرگاہوں سے آئی تھیں۔ ان کے سامنے ساحل پر طرح طرح کا تجارتی سامان رکھا تھا۔ بوریاں، لکڑی کے بڑے بڑے صندوق، الیکٹرانک سامان کے کارٹن، موٹر سائیکلیں، ڈبوں میں بند بجلی کے جنریٹر اور بے شمار دوسری چیزیں — ناصر ان کے بیچ میں سے راستہ بناتا آگے بڑھتا گیا۔ اچانک ایک کشتی کے عرشے پر اسے سندباد جہازی نظر آیا۔ اس نے ناصر کو دیکھتے ہی دور سے ہاتھ ہلایا اور اپنی طرف بلایا۔ لمبی سی سیڑھی چڑھ کے ناصر کشتی کے اندر چلا گیا۔

''مرحبا!'' سندباد نے کہا، ''تم کہاں غائب ہوگئے، اس دن کے بعد — سنا ہے ابوعبید نے کارخانہ بھی بیچ دیا ہے کسی کویتی کو۔ مگر وہ یہاں زیادہ ٹھہرے گا نہیں۔ جلد ہی واپس چلا جائے گا۔ تمھیں پتا نہیں، اس عراقی بڈھے کے ساتھ کیا ہوا ہے؟''

''خیر، ابوعبید تو اب 'سلطان البحر' پر ساری توجہ دے رہا ہے —'' ناصر نے کہا، ''مگر تم کہاں جا رہے ہو، اس کشتی کے ناخدا بن کے؟''

''میں مالابار جا رہا ہوں اس بار۔'' وہ بولا، ''واپسی میں کچھ دن تو لگیں گے — یہاں خالی پڑا سڑ رہا تھا، سوچا پھر سے جل پریوں کی تلاش میں نکلوں — اچھا ابوعبید کو میرا سلام کہنا اور کبھی کبھی موکھی کے شیشہ خانے میں چلے جایا کرو، اور وہ جونمیلا کی بیٹی ہے نا وہاں، اس سے کہنا میں پھر آؤں گا۔''

ناصر سندباد سے رخصت ہو کے نکلا تو سامنے ہی ایک ملباری ہوٹل پر نائر سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ہوٹل کے باہر چھوٹے سے باغیچے میں گول میز کے گرد سجی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھا تھا۔ اس نے ناصر کو اپنے پاس بٹھایا اور ہاتھ اٹھا کے بیرے کو اشارہ کیا۔ ذرا دیر میں بیرا ان کے سامنے ملباری پراٹھے اور قیمے کی پلیٹیں رکھ گیا۔ ملباری پراٹھے ناصر کو بھی بہت پسند تھے۔



انہیں دیکھ کے اسے فریدون خستہ تن کی یاد آتی تھی۔ پراٹھے کی خوبی یہ تھی کہ ان میں چکنائی بہت کم ہوتی تھی، لگتا تھا جیسے انھیں گھی کے بجائے پانی میں تلا گیا ہو۔ انھیں چائے کے ساتھ کھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ ناصر نے پہلا لقمہ ہی توڑا تھا کہ بیرا ان کے سامنے گرما گرم چائے بھی رکھ گیا۔

''میں تمھاری تلاش میں تھا۔'' نائر بولا، ''اگر آج تم سے یہاں ملاقات نہ ہوتی تو میں مرشد بازار میں تمھارے لاریوں کے گودام پر آتا۔''

''کیوں؟'' ناصر نے پوچھا، ''کہیں ابوعبید نے تو یاد نہیں کیا؟''

''نہیں۔'' نائر نے کہا، ''وہ تو ان دنوں صلالہ گیا ہوا ہے کاروباری چکر میں — میں تمھیں اونم دعوت میں بلانے آیا تھا۔ اگلے ہفتے اونم ہے۔ ہم کیرالہ والوں کا جشنِ بہار — دن بھر کا پروگرام ہوگا۔ میں تمھیں لینے آؤں گا۔''

''یہ اونم کیا بلا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''بلا نہیں راکشس کہو — ایک عفریت مگر محبت کرنے کے قابل۔'' نائر نے جواب دیا، ''ہم ایک دن ہر سال اس کا جشن مناتے ہیں کیوں کہ اس دن وہ زمین کی پاتال میں اپنے قید خانے سے نکل کے خاص طور پر ہم سے ملنے آتا ہے۔''

''اس دن بھی آئے گا وہ —؟'' ناصر نے حیرت سے پوچھا۔

''بالکل آئے گا، سب کو خوش کرنے، آشیرباد دینے، تم دیکھنا۔'' نائر نے کہا۔

''اتنے راکشس تو پہلے ہی یہاں موجود ہیں۔'' ناصر ہنسا۔

''تیار رہنا، صبح دس بجے، راکشس راجا کو مایوس مت کرنا۔'' نائر نے چائے کا کپ خالی کرتے ہوئے کہا۔



# ۲۰

# کھوئی ہوئی جنت

ناصر سونے کے لیے لیٹا تو اسے نائر کے بتائے ہوئے راکشس کا خیال آیا۔ پروفیسر عظمت علی بھی تو یہی کہتے تھے کہ انسان میں راکشس اور راکشس میں انسان ہوسکتا ہے، یہ سب اس کے ذہن کی کارفرمائی ہے۔ لہٰذا انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ذہنی تربیت کی طرف توجہ دے۔ پھر وہ ہنس کے کہتے مگر یہ حضرتِ انسان بھی خوب ہیں کہ ہمیشہ اپنے شکم کی صحت کے لیے پریشان رہتے ہیں جس کی وجہ سے انھیں بس بھوک مٹانے کا خیال رہتا ہے، ہر قسم کی بھوک مٹانے کا— اسی لیے جب انھیں غذا کی ضرورت ہوتی ہے تو محض ایسی غذا یاد آتی ہے جس سے پیٹ بھر جائے، ایسی غذا کی طرف ان کی توجہ کبھی نہیں جاتی جس سے ذہنی صحت برقرار رہے، یہ دماغی فتور ہے جو آدمی کو راکشس بنا دیتا ہے۔

ناصر نے سوچا، اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انسان اپنی کوشش سے راکشس بنتا ہے۔ ٹھیک کہتے تھے پروفیسر عظمت علی— اب اسے ان کے ناول کا خیال آیا، اس نے اپنے سرہانے سے ان کی کتاب اٹھائی اور وہیں سے پڑھنا شروع کی جہاں سے سلسلہ منقطع ہوا تھا۔ عجب واقعے کا بیان تھا۔ سارا منظر نگاہوں کے سامنے پھر گیا۔

ادھر گلے پر گرفت تنگ ہوئی، اُدھر سر پر درد کی تیز تلوار چمکی اور اس کے ساتھ ہی





اندھیرے کی ایک اونچی لہر نے آگے بڑھ کے ناصر کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر نجانے کون سا وقت تھا جب اس کی آنکھ کھلی اور اس میں انسانی خاکے ابھرے۔ ہر طرف دھندلاہٹ تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائیں۔ دھند میں دو چہرے اس کی جانب بڑھے۔

''میں ڈاکٹر ہوں۔'' ایک آواز آئی۔ اس نے آنکھیں پوری طرح کھول دیں۔ ڈاکٹر اس پر جھکا ہوا تھا۔

''میں کہاں ہوں؟'' اس نے کم زور آواز میں پوچھا۔

''ڈاکٹر نے کہا، ''شکر ادا کرو اللہ کا، تم پھر سے اس دنیا میں لوٹ آئے ہو، جہاں تم پیدا ہوئے تھے۔'' ڈاکٹر خوش دلی سے مسکرایا، ''میرا مطلب ہے، زندگی کی نئی صبح مبارک ہو!''

''مجھے کیا ہوا تھا؟'' اس نے پوچھا۔

ڈاکٹر نے کہا، ''تمھیں زخمی حالت میں پل کے نیچے ایک گندے نالے میں پایا گیا تھا۔ تم بے ہوش تھے۔ کون لوگ تھے وہ جنھوں نے تمھارے ساتھ یہ سلوک کیا؟''

''کون لوگ تھے وہ—؟'' ناصر نے ذہن کے بند دریچے کو کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ایک پٹ کھلا اور کئی چہرے چمکے اور کئی لمحے تڑپ کے باہر نکلے— سائیں راول، نوری، رستے جو چائے خانو— پھر سب تصویریں گڈمڈ ہوگئیں۔

ڈاکٹر نے کہا، ''تمھارے سر میں چوٹ آئی ہے اور ایک پاؤں میں فریکچر، پسلیاں بھی زخمی ہیں۔''

ناصر نے اپنے کو ٹٹولا۔ وہ پٹیوں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں چھوئے۔ دائیں پاؤں میں گھٹنے تک پلاستر چڑھا ہوا تھا اور پسلیوں پر بھی پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔

ڈاکٹر نے دوسرے چہرے کی طرف اشارہ کیا، ''یہ ہیں وہ صاحب جنھوں نے تمھیں نالے کے پاس سے اٹھایا اور اسپتال لے کر آئے۔''

''ہاں، میں اتفاق سے اپنی جیپ میں ادھر سے گزر رہا تھا صبح کے وقت، کہ تم پلیا کے نیچے بے ہوش پڑے نظر آئے— ویسے ہوا کیا تھا، کوئی لڑائی جھگڑا؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''یاد نہیں۔'' ناصر نے جواب دیا۔

"تمھارا نام کیا ہے نوجوان؟" اس نے پھر سوال کیا۔

"ناصر — مجھے یاد نہیں کہ میرا کسی سے جھگڑا ہوا تھا، میں تو شاید سائیں راول کے چائے خانے میں سو رہا تھا۔" وہ بولا۔

اس آدمی نے کہا، "ہاں، ایسا ہوتا ہے آدمی سر پر چوٹ لگنے سے بہت سی باتیں بھول جاتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کہا، "یہ تو سیدھا سادا پولیس کیس تھا میرے دوست مگر بادشاہ خان بڑے کمال کے انسان ہیں، انھوں نے پولیس کو ادھر پھٹکنے بھی نہیں دیا، لہٰذا فکر کی کوئی بات نہیں۔"

دوسرا آدمی اس کے بستر کے پاس آیا۔ اس کے چہرے پر گھنی سیاہ داڑھی تھی جس پر موٹے فریم والی کالی عینک بڑی اچھی لگ رہی تھی۔ اس نے نسواری رنگ کا کُرتہ شلوار پہن رکھا تھا اور کالی واسکٹ۔ پھر اس نے واسکٹ کی جیب میں سے گولڈ لیف کا پیکٹ نکالا اور اس پر قلم سے کچھ لکھتے ہوئے بولا، "ویسے تم کراچی میں کہاں رہتے ہو ناصر — تمھارے گھر والوں کو تو اطلاع دینا ہوگی اس حادثے کی، ذرا پتا بتاؤ، تمھارے والد، تمھارے بھائی، کن کو بتایا جائے؟"

ناصر نے کہا، "میں تین ہٹی پر رہتا ہوں جناب — مگر آپ تکلیف نہ کریں، میرے والد تو ہیں ہی نہیں — بس والدہ ہیں اور بڑا بھائی اور اُن کی بیوی اور ایک بیٹا! مگر انھیں پریشان کرنے سے کیا فائدہ — میں ٹھیک ہو جاؤں تو خود ہی اُن کے پاس پہنچ جاؤں گا — ویسے بھی میں ان سے یہ کہہ کر نکلا تھا، گھر سے کہ نوکری کی تلاش میں دور جا رہا ہوں شاید لوٹنے میں کچھ دن لگیں۔"

بادشاہ خان نے کہا، "تم نوکری کا فکر مت کرو، میرا اپنا کاروبار ہے — بس تم اچھے ہو جاؤ۔"

ناصر نے کہا، "کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ہوا کیسے؟ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں سائیں راول کے یہاں سو رہا تھا، وہ جو ہائی وے پر ایک ہوٹل ہے — رستے جو چائے خانو — کل رات ہی کی تو بات ہے!"



"کل رات؟ نہیں،" ڈاکٹر بولا، "تین دن سے تم اس اسپتال میں ہو۔ سر کی چوٹ ی تھی اس لیے اتنی دیر میں ہوش آیا۔"

ناصر چونکا، "ارے تین دن ہو گئے۔ مگر اب مجھے جانا ہوگا — کیا میں جا سکتا ہوں؟"

"کیا — ؟" ڈاکٹر بولا، "ایسے کیسے جا سکتے ہو تم، ابھی تمھاری ٹانگ میں فریکچر ہے زخم بھی تازہ ہیں۔ ابھی تم آٹھ دس دن یہیں ٹھہرو، پھر چلے جانا۔"

بادشاہ خان نے بھی تسلی دی، "تمھیں اسپتال سے چھٹی ملے گی تو میں تمھیں خود تمھارے گھر چھوڑ آؤں گا۔"

ناصر نے کہا، "مگر میں پہلے سائیں راول کے ہوٹل پر جانا چاہتا ہوں۔ سپر ہائی وے جہاں سڑک ایک پہاڑی پر چڑھ کے نشیب میں اترتی ہے۔"

بادشاہ خان مسکرایا، "لگتا ہے سائیں راول سے بڑی دوستی ہے تمھاری — ؟"

"ہاں — !" ناصر نے کہا، "وہ بہت اچھا بندہ ہے۔"

بادشاہ خان نے داڑھی کو اپنی انگلیوں سے گدگدایا اور بولا، "اچھا تم ابھی آرام کرو، میں سائیں راول کو بھی تمھاری خیریت بتا دوں گا بلکہ بعد میں تمھیں وہاں لے بھی چلوں گا، ٹھیک ہے؟"

ناصر کچھ دیر آنکھیں موندے لیٹا رہا، پھر اچانک اسے کسی کے آنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔ اس نے دیکھا، سائیں راول اس کے بستر کے پاس کھڑا تھا، "ارے چاچا آپ؟" ناصر نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی۔

"نہ نہ بابا —" سائیں راول نے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے اُسے لٹا دیا، "مجھے خبر نہیں تھی کہ تم اسپتال میں ہو، تمھارے ساتھ یہ سلوک، تمھارا تو کوئی دشمن بھی نہیں۔"

"پتا نہیں چاچا!" ناصر بولا، "وہ میرا دشمن ہے یا آپ کا دشمن۔"

ناصر کچھ دیر خاموش رہا، پھر بولا، "نوری کیسی ہے؟"

"نوری —" سائیں راول نے کہا، "پریشان ہے بابا، وری تم پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ تو گھر آنا — ہم سب تمھارے انتظار میں ہیں۔"

اسی لمحے کسی نے ناصر کو پکارا۔ ناصر نے آنکھیں کھولیں، سامنے سائیں راول کے بجائے اس کا بڑا بھائی عارف کھڑا تھا— ''بھائی آپ؟'' اس نے حیران ہو کے پوچھا۔

''ہاں میں!'' عارف نے کہا، ''ہمیں آج ہی اطلاع ملی تھی، یہ سب کیا ہوا ناصر؟''

''مجھے خود کچھ پتا نہیں۔'' ناصر نے کہا۔

''اسپتال سے چھٹی ملتے ہی گھر آجاؤ، اماں بہت پریشان ہیں۔ میں انھیں ساتھ نہیں لایا کہ پتا نہیں تمھیں کس حال میں دیکھنا پڑے۔'' عارف نے کہا۔

ناصر چپ رہا۔ عارف پھر بولا، ''تم کہیں نہیں جانا، میں خود تمھیں لینے آؤں گا، دو ایک دن کے لیے اسکول سے چھٹی کرلوں گا، تمھاری بھابی خود بھی بہت اَپ سیٹ ہیں اور تمھارا بھتیجا عرفان بھی۔''

ناصر نے کہا، ''بھائی آپ سب کو سمجھائیں، اماں کو بھی اور بھابی کو بھی— میں خود ہی آ جاؤں گا، آپ کو چھٹی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پتا ہے اسکول میں امتحانات کا زمانہ ہے اور ٹیچروں کو اس زمانے میں چھٹی ملنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔''

''ناصر ٹھیک کہہ رہا ہے۔'' اچانک کسی نے کہا۔

ناصر نے گردن موڑ کے دیکھا، دروازے سے بادشاہ خان وارڈ میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے کہا، ''اچھا تو یہ تمھارے بھائی ہیں!'' پھر وہ ناصر کے بھائی سے مخاطب ہوا، ''ناصر کو گھر پہنچانے کی ذمے داری میری ہے۔ آپ اطمینان رکھیں۔''

ناصر نے کہا، ''بھائی یہ بادشاہ خان صاحب ہیں، انھوں نے مجھے اسپتال پہنچایا تھا، کراچی میں ان کا کاروبار ہے۔''

عارف نے بادشاہ خان سے ہاتھ ملایا، ''آپ کا احسان ہے ہم لوگوں پر— مجھے پتا نہیں تھا کہ ناصر کی مدد کے لیے آسمان سے فرشتے زمین پر اتر آئے ہیں۔''

بادشاہ خان ہنسنے لگا۔ عارف نے ناصر کی پیشانی چھوئی اور کہا، ''اچھا اب میں چلتا ہوں، اتوار کے روز پھر چکر لگاؤں گا۔''

بادشاہ خان نے کہا، ''ہوسکتا ہے اتوار تک انھیں گھر جانے کی اجازت مل جائے۔''



عارف کمرے سے نکل گیا تو بادشاہ خان بستر کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔

''میرا خیال ہے، دو ایک دن میں تم اپنے گھر جاسکو گے مگر پاؤں کی ہڈی جُڑنے میں چار پانچ ہفتے ضرور لگیں گے، اس دوران آرام کرنا۔'' اس نے مشورہ دیا۔

ناصر بولا، ''ہاں ٹانگ کی وجہ سے گھر میں قید رہنا پڑے گا، بوریت ہی بوریت۔''

''بوریت کیوں—؟'' بادشاہ خاں نے کہا، ''بستر پر لیٹے لیٹے تم بہت سارے کام کرسکتے ہو، ٹی وی دیکھ سکتے ہو، اخبار اور رسالے پڑھ سکتے ہو، اور کچھ نہیں تو آنکھیں موند کے اپنے دوستوں کو یاد کرسکتے ہو۔''

''پڑھ سکتا ہوں مگر پڑھنے میں دل نہیں لگتا۔ میٹرک کے بعد کالج میں جانے کے بجائے میں چکر چلا کے پہلے ویگن کا کنڈکٹر پھر ڈرائیور بن گیا مگر میرا بھائی پڑھا لکھا ہے اور اسکول میں پڑھاتا ہے، بھابی بھی اسکول ٹیچر ہے— میں ہی نکما ہوں بس اپنے گھر میں۔''

ناصر نے کہا، ''اب تو ویگن ڈرائیوری بھی نہیں رہی۔''

بادشاہ خان بولا، ''نوکری کا غم مت کرو۔ تم خوب صورت جوان ہو، بات چیت کرسکتے ہو، نوکری کا ذمہ میں لیتا ہوں، بس تم فٹافٹ چونے کے اس پنجرے سے باہر نکل آؤ۔'' اس نے اس کی ٹانگ پر لگے سفید پلاستر پر ہاتھ پھیرا اور ہنسا۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر ناصر نے کہا، ''مجھے سائیں راول کے چائے خانے پر بھی جانا ہوگا۔''

بادشاہ خان ایک دم سنجیدہ ہوگیا، ''تمھارا یہ سائیں راول کیا چیز ہے بھئی— اچھا خاصا جادو کردیا ہے تم پر— وہ تمھارے دل سے نکلتا ہی نہیں— معاملہ کیا ہے؟''

ناصر نے کہا، ''معاملہ کچھ نہیں، وہ دوست ہے میرا۔''

بادشاہ خان مسکرایا، ''دوست ہے یا کوئی اور بات بھی ہے، کوئی لڑکی وڑکی تو نہیں اس کی؟''

ناصر نے جواب دیا، ''لڑکی تو ہے مگر آپ جو سمجھ رہے ہیں، وہ بات نہیں۔''

''پھر کیا بات ہے؟'' بادشاہ خان بال کی کھال نکالنے پر تلا ہوا تھا۔

''مجھے سائیں راول پسند ہے، اس کی سادگی، اس کی اپنائیت، اس کی محبت — وہ مجھے بڑا اپنا اپنا سا لگتا ہے۔'' ناصر بولا۔

''خطرناک بات ہے؟'' بادشاہ خان نے داڑھی کھجاتے ہوئے کہا، ''کچھ سوچنا پڑے گا۔'' وہ کھڑا ہوگیا، پھر بولا، ''میں ذرا تمھارے ڈاکٹر سے بات کرکے ابھی آیا، اس نے کہا تھا کہ جاتے وقت مل لیں۔''

ناصر نے آنکھیں بند کرلیں۔ اچانک اسے لگا جیسے کسی نے اسے آواز دی ہو۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ عنابی اجرک کے ہالے میں دمکتا ہوا ایک چہرہ اس کے سامنے تھا۔

''نوری؟'' اس نے دھیرے سے کہا۔

''ہاں۔'' وہ بولی، ''تم اچانک کہاں چلے گئے تھے۔ بابا کو کوئی چیز بھی اچھی نہیں لگتی۔''

''اور تمھیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

مگر نوری نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے پوچھا، ''تم کب سے یہاں؟''

ناصر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ بادشاہ خان کی آواز اس کے کان میں آئی، ''مبارک ہو بابا — ڈاکٹر نے کہا ہے کہ میں تمھیں کل ہی یہاں سے لے جاسکتا ہوں۔''

ناصر نے آنکھیں پھاڑ کے اِدھر اُدھر دیکھا۔ نوری جاچکی تھی، صرف بادشاہ خان اس کے سرھانے کھڑا تھا، ''حیران ہوگئے نا؟'' وہ بولا، ''ڈاکٹر کہہ رہا تھا کہ تمھاری چوٹیں اب تقریباً ٹھیک ہوگئی ہیں۔ صرف ٹانگ پر پلاستر رہے گا، تو رہے — باقی سب خیر ہے۔''

ناصر نے پوچھا، ''تو گویا میں کل سے؟''

''ہاں — بادشاہ خان نے جواب دیا، ''میں تمھیں کل دوپہر سے پہلے لینے آؤں گا۔''

ناصر نے کہا، ''ٹھیک ہے مگر آپ کو اپنا وعدہ تو یاد ہے نا؟ پہلے آپ مجھے سائیں راول کے ہوٹل پر لے جائیں گے۔''

بادشاہ خان اچانک چپ ہوگیا، پھر آہستہ سے بولا، ''میں وہاں گیا تھا ناصر!'' وہ پھر چپ ہوگیا جیسے ناصر کے ردِعمل کا انتظار کررہا ہو۔

''آپ سائیں راول کے ہوٹل پر گئے تھے؟'' ناصر نے پوچھا۔ حیرانی اس کے



چہرے پر سوالیہ نشان کی طرح اُبھری ہوئی تھی، ''پھر آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں، آپ کی سائیں راول سے ملاقات ہوئی، انھوں نے میرے بارے میں پوچھا؟''

بادشاہ خان چپ رہا۔ ناصر نے بے تابی سے پھر سوال کیا، ''بتایئے نا، سائیں راول نے کیا کہا؟''

''کچھ نہیں۔'' بادشاہ خان نے جواب دیا، ''اس لیے کہ وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ نہ وہ، نہ اس کا ہوٹل۔ وہاں تو کچھ بھی نہیں ہے میرے دوست، صرف ڈھئی ہوئی دیواریں، پھٹی ہوئی چٹائیاں اور گرا ہوا سائن بورڈ — معلوم نہیں وہ لوگ کہاں چلے گئے۔''

ناصر کو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا۔ اس کی تو جنت ہی کھوگئی تھی۔



# ۲۱

# راکشس راجا

النصر کلب کے، بیرونی برآمدے میں گلچیں لڑکیاں صبح سے پوکلم کے نقش بنا رہی تھیں۔ ہر نقش کیا تھا، اپنے آپ میں ایک مکمل گلستاں تھا، جو اُن کے دستِ ہنرمند کے لمس سے مزید گلنار ہو گیا تھا۔ اصل میں پوکلم پھولوں سے بنا ہوا پھول تھا؛ جسے دیکھ کے ملباری لڑکیوں کے حسنِ نظر، حسنِ انتخاب اور حسنِ ترتیب کو بے ساختہ داد دینے کو جی چاہتا تھا۔

یہ اونم کی صبح تھی اور فرش پر پھولوں سے بنے ہوئے قالین بڑے ہوتے جا رہے تھے۔ ان میں طرح طرح کے پھول، پنکھڑیاں اور پتے پتیاں استعمال کی گئی تھیں۔ مہابلی کے استقبال کی تیاریاں جاری تھیں۔

نائر نے کہا، ''پوکلم کی نقش گری سے پہلے فرش کو گوبر سے لیپ پوت کے پاک کیا جاتا ہے تاکہ بھومی دیوی کو— جو دھرتی کی آتما ہے— یہاں قدم دھرنے میں تامل نہ ہو۔ مہابلی بھی ہمیشہ تازہ پھولوں کے قالین پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔''

اس نے کہا، ''ابھی دیکھنا، ان کا جلوس مرکزی دروازے سے اندر داخل ہوگا اور اپنے پرستاروں کی معیت میں زردوزی کے کام والی سرخ چھتری تلے آہستہ آہستہ قدم بڑھاتے ہوئے مہابلی خود جلوس کی قیادت کر رہے ہوں گے۔''







''مہابلی پیدل آئیں گے کیا؟'' ناصر نے پوچھا۔

''ہاں۔'' نائر نے جواب دیا، ''کیرالہ ہوتا تو مہاراج سونے کے زیورات سے سجے ہوئے ہاتھیوں کی قطار میں سب سے آگے کسی پہاڑ جیسے ہاتھی کی پشت پر سونے کے ہودج میں براجمان ہوتے یا پھر ملباری روایتی کشتی کویلان میں سوار ہوتے جو شیش ناگ جیسی ہوتی ہے تاکہ لٹیرے اور ڈاکو دور رہیں، مگر یہاں تو مہاراج پیدل ہی پدھاریں گے۔''

''اب ذرا مہابلی کا تعارف بھی کرادو کہ یہ ہیں کون؟'' ناصر نے کہا۔

نائر نے کہنا شروع کیا، ''میں تمھیں بتاتا ہوں، مہابلی مالابار کے راجا تھے مگر وہ مانس نہیں راکشس تھے لیکن ان کا دل سونے کا بنا تھا— بہت نیک، سخی، دیالو اور مہربان۔ ان کے راج میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے اور پرجا اُن پر جان چھڑکتی تھی۔''

ناصر نے کہا، ''یوں تو سبھی راجا راکشس ہوتے ہیں مگر ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ عوام ان کے گرویدہ ہوں۔''

نائر نے کہا، ''بس یہی تو گڑبڑ ہوئی، مہابلی کی مقبولیت لوگوں میں اتنی بڑھ گئی کہ آکاش پر دیوتا اُن سے جلنے لگے اور انھیں ڈر ہوا کہ کہیں ایک راکشس عوامی مقبولیت میں دیوتاؤں سے آگے نہ بڑھ جائے۔ تب انھوں نے فیصلہ کیا کہ مہابلی کو اس کی حد سے بڑھی ہوئی سخاوت اور انسان دوستی کا مزہ چکھایا جائے۔''

پھر ایک دن ورن دیوتا راکشس راجا کے دربار میں ایک بھکشو کے روپ میں آیا۔ اس نے مہابلی سے کہا کہ وہ اس کی دریا دلی کے چرچے سن کے اس کے پاس ایک سوالی بن کے آیا ہے، اس امید پر کہ جو مانگے گا، اسے ملے گا۔''

مہابلی نے کہا، ''مانگو تمھیں جو مانگنا ہے میں وچن دیتا ہوں کہ تمھاری ہر مانگ پوری کروں گا۔''

''تو سنو— '' بھکشو نے کہا، ''مجھے پیر ٹکانے کے لیے بس تین قدم زمین چاہیے۔''

مہابلی نے مسکرا کے کہا، ''بس تین قدم— چلو تمھاری درخواست قبول کی جاتی ہے، تم اپنے پیروں سے مطلوبہ رقبہ ناپ لو۔''

بھکشو یہ سنتے ہی اپنے اصلی روپ میں آ گیا اور اس کا سر آسمان سے جا لگا۔ پھر اس نے ایک قدم اٹھایا اور سارا آکاش اور چاند تارے سب اس کے ایک قدم تلے سما گئے، پھر اس نے دوسرا قدم اٹھایا اور ساری دھرتی اور ساری اندرونی دنیا اس میں سما گئی۔

بھکشو نے پوچھا، ''اب میں کیا کروں، اپنا تیسرا قدم کہاں رکھوں؟''

مہابلی نے اب ورن دیوتا کو پہچان لیا تھا، وہ سر جھکا کے بولا، ''میرا سر حاضر ہے، اب شوق سے اس پر اپنا پاؤں جماؤ۔''

''دیوتا نے مہابلی کے سر پر اپنا پاؤں رکھا اور اسے زمین کی پاتال تک دھنساتا چلا گیا۔ اب مہابلی وہیں قید ہے مگر اس نے جاتے وقت دیوتا سے وچن لیا تھا کہ اسے سال میں ایک بار قید خانے سے باہر آ کے اپنی پرجا سے ملنے اور اُن کا حال جاننے کا موقع دیا جائے گا اور اب راکشس راجا ہر سال ایک دن اپنے لوگوں سے ملنے آتا ہے اور اس دن کو اونم کہتے ہیں۔''

''اور یہ دن کب آتا ہے؟'' ناصر نے کہا۔

''اونم ملیالم کے مہینے چنگم کے دوران اتھم کے دسویں دن منایا جاتا ہے اور اس پورے عشرے کو عشرۂ بہار کہنا چاہیے۔'' نائر نے جواب دیا۔

ناصر نے کہا، ''بھئی اس سارے جشن کا مجھے تو یہی پیام نظر آتا ہے کہ راکشس اور دیوتا کے بیچ بس چند قدموں کا فاصلہ ہے— راکشس اچھا بنے تو دیوتا اور دیوتا کی انا بگڑے تو وہ راکشس بن جاتا ہے۔''

اسی وقت باہر شور ہوا اور ناصر نے دیکھا کلب کے مرکزی دروازے کے اندر اونم جلوس داخل ہو رہا ہے۔ آگے سرخ منقّش چھتری تلے مہابلی تھا۔ سر پر سونے کا تاج، سرخ لبادہ اور گلے میں موتیوں کی مالا اور اس کے آگے اور پیچھے لوگوں کا ہجوم، گیت گاتا ہوا— مرد سجے بنے، عورتیں سنہرے بورڈر والی ہلکی بادامی رنگ کی ساڑھیاں پہنے، پھولوں کے گجرے گلے میں ڈالے۔

پیتل کے روایتی چراغ دان کو جس میں اوپر تلے بہت سے ناریل کے تیل سے جلنے



والے چراغ تھے، آگے لایا گیا اور سارے چراغوں کو روشن کر کے 'اونا چنتھا' سے تقریب کا آغاز ہوا۔ کچھ دیر ناچ گانے اور کھیل کود کے مقابلے ہوتے رہے اور اس کے بعد بڑے ہال میں کھانے کی محفل جمی۔ نائر نے کہا، ''اس کھانے کو 'اونا سدنا' یا اونم لنچ کہتے ہیں اور اسے جشنِ اونم کا 'دل' کہا جاتا ہے حالاں کہ اس کا تعلق 'شکم' سے زیادہ ہے۔ اس میں آٹھ بنیادی کورس ہوتے ہیں اور تقریباً چونسٹھ قسم کے کھانے۔''

ناصر نے کہا، ''باپ رے باپ! عام طور پر ہمت بڑھانے کو لوگوں سے کہتے ہیں کہ 'دل بڑا رکھو'، مگر یہاں یہ فقرہ اس طرح کہنا ٹھیک رہے گا کہ شکم بڑا رکھو۔''

دونوں کھانے والوں کی صف میں بیٹھے تو ان کے سامنے کیلے کے بڑے بڑے پتے چن دیے گئے۔ نائر نے کہا، ''لو بھئی بس یہی ہے تمھارا دسترخوان اور کھانے کا طشت بھی— اور چونکہ اونم کیرالا کا تہوار ہے اور کیرالا کیر کی سرزمین ہے یعنی ناریل کے پیڑوں کی، لہٰذا کھانے میں ناریل اور کیلے کی بہتات کا برا نہ ماننا۔''

ناصر نے کہا، ''واللہ مجھے کھانے میں دونوں چیزوں کے شامل ہونے پر اس وقت تک کوئی اعتراض نہ ہوگا جب تک کہ مجھے ناریل کے کسی پیڑ پر چڑھ کے کیلا کھانے کو نہ کہا جائے۔''

نائر ہنسنے لگا۔

ناصر نے اپنے سامنے رکھے کیلے کے بڑے سے پتے پر ہاتھ پھیر کے کہا، ''ویسے اس سے زیادہ صاف ستھری اور صحت افزا طشتری کھانے کے لیے اور کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ آخر فطرت کی عطا کی ہوئی ہے۔''

نائر نے کہا، ''بس لوگوں کو یہی احساس دلانے کے لیے ہی تو ہم نے یہ سارا کھیل رچایا ہے۔''

اسی وقت کھانے کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک خوش شکل اور خوش ادا سانولی خاتون ناصر کے آگے رکھے پتے کے بائیں طرف کے نچلے حصے پر ایک عدد کیلا، میٹھے کیلے کی مٹھائی، کیلے کے نمک پارے اور پاپڑ سجا کے چلی گئیں۔ اگلے مرحلے میں پتے کے بائیں طرف کے اوپر والے حصے پر مختلف قسم کی سبزیاں جن میں ناریل کو مختلف طریقوں سے

استعمال کیا گیا تھا، پیش کی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ سلاد، نیبو اور آم کا اچار بھی — ادرک کی چٹنی بھی موجود تھی۔

نائر نے کہا، ''ادراک کی اس خاص چٹنی کو 'انجی پولی' کہتے ہیں۔''

ناصر بولا، ''مجھے تو سارا کھانا ہی 'انجی پولی' لگ رہا ہے۔''

نائر نے کہا، ''ابھی صبر کرو اور دیکھو آگے کیا ہوتا ہے۔''

خاتون ایک بار پھر اپنے ہونٹوں پر سانولی سلونی مسکراہٹ سجائے ہوئے آئیں اور انھوں نے اس بار کیلے کے پتے کے درمیانی حصے پر تھوڑے سے چاول رکھے، ان پر دال چھڑکی اور پھر اس پر سانبھر کا تڑکا لگایا۔

ناصر نے پوچھا، ''ابھی اور کتنی ڈشیں باقی ہیں؟''

مسکراتی خاتون نے کہا، ''بس میٹھا اور۔''

نائر نے کہا، ''میٹھی ڈش بھی دو طرح کی ہوتی ہے، ایک میں گڑ کی راب استعمال ہوتی ہے اور دوسری میں چینی — تمھیں کیا پسند ہے؟''

ناصر نے کہا، ''میرے لیے تو ان کی میٹھی مسکراہٹ ہی کافی ہے۔ ذیابیطس کا مریض ہوں بھائی!''

کھانے کے بعد دونوں باہر آئے تو ہال میں ناچ گانے کا سلسلہ جاری تھا اور خواتین کیرالا کا روایتی 'کیکوتیکلی' رقص پیش کر رہی تھیں۔ پھر اچانک کچھ مردوں کو جوش آیا اور وہ چہروں پر کالی، پیلی اور لال لکیریں کھینچ کے چیتے بنے ہوئے باہر نکلے اور ڈھول کی تھاپ پر اُچھلنے کودنے لگے۔

''یقیناً اس کو 'چیتا رقص' کہتے ہوں گے؟'' ناصر نے پوچھا۔

نائر نے کہا، ''کیرالا میں اسے 'پولی کلی' رقص کہتے ہیں اور لوگ اونم کے روز گھر گھر جا کے یہ ناچ دکھاتے ہیں۔''

ناصر نے سر ہلایا، ''سچ کہتے ہو، اونم لنچ ہوتا ہی اتنا زوردار ہے کہ آدمی چیتا بن جاتا ہے۔''



رخصت ہوتے ہوئے ناصر نے کہا، ''یار نائر! میں تمھارے مہابلی سے بہت مرعوب ہوا، کیسا راکشس ہے جو انسان بن کے سوچتا ہے، دیوتا بن کے نہیں سوچتا! ہماری دنیا تو ایسے دیوتاؤں سے بھری ہے جو بس راکشس بنے ہوئے ہیں، ایک دیوتا کو تو ہم بھی دیکھ رہے ہیں کہ اس نے چند قدموں میں ساری زمین اور سارے آسمان پر اپنا قبضہ جما لیا ہے! ہے تو وہ راکشس، مگر لوگ اسے دیوتا سمجھتے ہیں۔''



# ۲۲

# یادوں کا گودام

ناصر نے پھر کتاب کھولی اور نجانے کتنے پرانے منظر اس کے کمرے میں پرے باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

''ناصر کی ٹانگ کا پلاستر اترے ایک ہفتہ ہو چکا تھا مگر ذہنی طور پر وہ ابھی تک اس الجھن سے نجات نہیں حاصل کر پایا تھا کہ آخر سائیں راول اور نوری پر کیا گزری اور وہ لوگ کہاں غائب ہو گئے۔ اس کا خیال تھا کہ وہ تھوڑا اور بہتر ہو جائے تو خود اس گتھی کو سلجھانے نکلے مگر اسے پتا تھا کہ فی الحال اس کے گھر والے اسے کہیں نہیں جانے دیں گے، اسی لیے وہ گھر پر ہی رہتا۔

ہر نماز کے بعد اماں اس کے پلنگ کے پاس بچھی چوکی پر بیٹھی تسبیح کے دانے گھماتے ہوئے اس کی صحت یابی کی دعائیں مانگتی رہتیں۔ اس وقت بھی وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے منہ ہی منہ میں سمجھ میں نہ آنے والی دعائیں دُہرا رہی تھیں۔

اسی وقت اس کا بھائی عارف اسکوٹر لیے اندر داخل ہوا۔ اس کے ساتھ عرفان بھی تھا، اپنا بستہ اٹھائے — دونوں اسکول سے آئے تھے۔ بھابی پہلے ہی آ چکی تھیں اور اس وقت باورچی خانے میں کھانا گرم کر رہی تھیں۔





عارف نے اپنا اسکوٹر صحن کے ایک کونے میں کھڑا کیا اور کمرے کے اندر آ گیا جہاں ناصر بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ''سلام اماں!'' اس نے کہا، ''اب کیسا ہے ہمارا شہزادہ؟''

اماں مسکرائیں، ''شکر ہے اللہ کا۔''

ناصر نے کہا، ''اب تو میں بالکل ٹھیک ہو چکا ہوں مگر اماں یہی سمجھتی ہیں کہ میں بیمار ہوں، ذرا بھی پلنگ سے ہلنے نہیں دیتیں۔ لگتا ہے مجھے بالکل ہی کاہل اور نکما بنا کے چھوڑیں گی۔ پہلے ہی میں نے کتنا مایوس کیا ہے آپ لوگوں کو۔ پڑھائی میں نے پوری نہیں کی، نوکری بھی قاعدے کی نہیں ملی، پھر یہ آفت — مگر میں نے سوچا ہے کہ اب نوکری کی تلاش میں نکلوں گا۔''

''کیا؟'' بھابی نے لکڑی کی چھوٹی سی میز پر کھانا چنتے ہوئے کہا، ''پھر وہی دورہ — جو ہوا، سو ہوا، اسے بھول جاؤ اور نئے سرے سے زندگی شروع کرو — میرا تو خیال ہے کہ تم نوکری کے بجائے دوبارہ پڑھائی شروع کر دو۔ کالج میں داخلہ لو۔''

''جی ہاں، میں پڑھتا رہوں اور آپ لوگ نوکری کرتے رہیں، گھر کا خرچ چلاتے رہیں، اچھا مشورہ ہے۔'' ناصر بولا، ''میں نوکری کروں گا اور رات کے کالج میں پڑھوں گا بھی۔''

عارف ہنسنے لگا، ''چلو یہ بھی برا خیال نہیں ہے مگر اب چلو کھانا کھائیں ورنہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔''

کھانا کھاتے ہوئے عارف نے مشورہ دیا، ''اگر تم نوکری کرنا چاہتے ہو تو بادشاہ خان سے کیوں نہیں ملتے۔ وہ تو کل بھی آیا تھا تمھارے پاس، اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے اور تم سے کچھ زیادہ ہی دوستی جتا رہا ہے۔''

ناصر نے کہا، ''ہاں، اس کے پاس بھی جانا ہے، وزیر میشن کے پاس اُس کی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی ہے۔ جاؤں گا کسی وقت، دیکھوں تو کیا کہتا ہے۔''

اچانک عرفان بیچ میں بول پڑا، ''چاچو، مگر ہم آپ کو کہیں دور نہیں جانے دیں گے۔''

ناصر ہنسا، ''نہیں بیٹا، میں اب تم لوگوں کو چھوڑ کے کہیں نہیں جاؤں گا۔''

ناصر نے کتاب بند کر دی اور لمحے بھر کے لیے آنکھیں موند لیں۔ وقت کے فریزر میں

سے ایک لمحہ کسی تصویر کی طرح برآمد ہوا۔

وہ بادشاہ خان گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کے دفتر میں، جو ایک پرانی عمارت میں واقع تھا، داخل ہوا تو بڑے پھاٹک کے اندر گودام میں ایک طرف اسے کئی ٹرک کھڑے دکھائی دیے۔ دوسری طرف بوریاں، لکڑی کی پیٹیاں اور بلٹیاں ڈھیر تھیں۔ ایک جانب لکڑی کا چھوٹا سا کیبن تھا جس میں شیشے لگے تھے تاکہ اندر سے باہر کا منظر دکھائی دیتا رہے۔ یہی بادشاہ خان کا دفتر تھا۔ وہ ایک بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھا ہوا تھا۔ پیچھے دیوار پر قائداعظم کی رنگین تصویر لگی تھی اور برابر میں ایک پرانا کیلنڈر ٹنگا ہوا تھا جس پر سورۂ رحمٰن کی خطاطی کا نمونہ چھپا ہوا تھا۔ کچھ لوگ بادشاہ خان کے ساتھ کھڑے تھے۔

ناصر نے پھر کتاب پر نگاہیں گاڑ دیں۔

''ناصر اندر داخل ہوا تو بادشاہ خان اپنی سیٹ سے اٹھا، ''آؤ، آؤ دوست ــــ'' وہ خوش ہو کے بولا، ''مجھے تمھارا ہی انتظار تھا۔'' اس نے دوسرے لوگوں کو رخصت کر کے ناصر کو ایک کرسی پر بٹھایا اور بجلی کے پنکھے کا رُخ اس کی طرف گھما کے زور سے آواز دی، ''خیر بخش! ارے او خیر بخش!''

خیر بخش تیزی سے اندر آیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر کا بلوچ تھا۔ کھچڑی بال اور پتلا سا کم زور چہرہ، سلیٹی رنگ کا لمبا کُرتہ شلوار اور ربڑ کی چپلیں پاؤں میں۔''

''حاضر خان صاحب۔'' وہ بولا۔

''خیر بخش ذرا ایک ٹھنڈی بوتل تو منگاؤ، اپنا یار آیا ہے، ناصر۔ یہ آج سے اپنے یہاں کام شروع کرے گا۔''

''مگر ــــ!'' ناصر نے کچھ کہنا چاہا۔

''مگر وگر کچھ نہیں۔'' بادشاہ خان بولا، ''آج سے یہ دفتر تمھارا ہے، اسے سنبھالو۔ مجھے اور بھی بہت کام ہوتے ہیں۔ میں روز یہاں نہیں آ سکتا۔ تم یہاں بیٹھو اور دیکھو کیا مال آتا ہے، کیا جاتا ہے۔ اس کا حساب کتاب تمھارا کام ہے۔ ہمارے ٹرک مال لے کر یہاں سے سندھ، پنجاب، بلوچستان اور سرحد کے تمام شہروں میں جاتے ہیں۔''



خیر بخش سیون اَپ کی ایک بوتل ناصر کے سامنے رکھ گیا۔ ناصر نے کہا، ''آپ کا شکریہ، مگر ذرا مجھے کام کو تو سمجھ لینے دیں، میں نے پہلے کبھی...''

بادشاہ خان بولا، ''خیر بخش رہے گا نا تمھارے ساتھ۔ وہ تمھیں ساری باتیں سمجھا دے گا، باقی تو ٹرکوں کے ڈرائیور، کلینر، مال ڈھونے والے، بلٹیاں تیار کرنے والے آتے جاتے رہتے ہیں ــــ ان سے نمٹنا تمھیں فوراً آ جائے گا۔''

اور پھر یہی ہوا۔ صرف مہینے بھر میں ناصر نے ٹرانسپورٹ کمپنی کے پورے نظام کو اچھی طرح سمجھ لیا۔ کن کن شہروں کو ٹرک جاتے ہیں، ان کے ڈرائیوروں کے نام کیا ہیں، مختلف اڈّوں پر ان کے ٹھہرنے کا انتظام کیا ہے، وزن اور حجم کے اعتبار سے مختلف شہروں کے لیے بلٹی کا ریٹ کیا ہے۔ مال اگر گودام میں مقررہ مدت سے زیادہ وقت تک پڑا رہے تو اس کا جرمانہ کس حساب سے وصول کرنا چاہیے اور گودام میں چوہوں کی آمدورفت کو روکنے کے لیے وہاں جو دو عدد بلیاں ڈیوٹی پر مامور ہیں، ان کے لیے دودھ اور چھیچھڑوں کا انتظام کس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے یہ بھی پتا چل گیا تھا کہ خیر بخش اگر کسی دن صاف ستھرے کپڑے پہنے اور باقاعدہ مانگ پٹی کیے نظر آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مستونگ سے اس کی گھر والی اس کے پاس آئی ہوئی ہے۔ خیر بخش لیاری کے ایک کوارٹر میں رہتا تھا اور جب اس کی بیوی پاس ہوتی تو وہ سات بجے ہی گھر چلا جاتا ورنہ آدھی رات تک ہی گودام میں بیٹھا رہتا۔

شروع شروع میں ناصر کو بھی کام ختم کر کے اٹھتے اٹھتے آٹھ نو بج جاتے مگر پھر وہ کوشش کر کے چھ بجے شام تک دفتر سے نکلنے لگا کیوں کہ اس نے شام کے ایک کالج میں داخلہ لے لیا تھا اور پابندی سے کلاسوں میں جانے لگا تھا۔

ناصر کو تعجب ہوا کہ پروفیسر عظمت علی نے کتنی تفصیل کے ساتھ اس کے شب و روز کو اپنے لفظوں میں ڈھال دیا تھا۔ اسے یاد آیا، سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا اور دن گزرتے جا رہے تھے، بس سائیں راول اور نوری کی یاد کبھی کبھی اسے بہت بے چین کر دیتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ انھیں کہاں ڈھونڈے۔ ایک اتوار کو وہ اپنے بھائی کا اسکوٹر مانگ کے سپر ہائی وے کا چکر بھی لگا آیا تھا مگر وہاں 'رُستے جو چائے خانو' کا نام و نشان باقی نہ رہا

تھا بلکہ اب اس کی جگہ ایک لمبی سی دیوار کھینچ دی گئی تھی اور لوگوں کا کہنا تھا کہ اس جگہ نیا قبرستان بننے والا تھا۔

ناصر نے کتاب کا اگلا صفحہ پلٹا، پھر نیا منظر۔

''اس دن ناصر اپنے دفتر میں بیٹھا کوئٹہ سے آنے والی بلٹیوں کا رجسٹر میں اندراج کر رہا تھا کہ خیر بخش اس کے پاس آیا، ''بابو ناصر!'' وہ بولا، ''آپ سے ایک کام ہے۔''

''تو بتاؤ!'' ناصر نے کہا، ''کیا کرسکتا ہوں میں تمھارے لیے؟''

''میرے لیے نہیں — '' خیر بخش بولا، ''وہ جو نور محمد ڈرائیور ہے نا، دادو ضلعے والا، بابا اسے چھٹی چاہیے۔ مگر وہ بادشاہ خان سے کہتے ہوئے ڈرتا ہے کیوں کہ کوئی دوسرا ڈرائیور ابھی ہے نہیں اور پرنس آف پنجاب لاہور جانے کو تیار ہے۔''

کمپنی کے سارے ٹرکوں کے الگ الگ نام تھے — فرنٹیئر میل، کوئٹہ ایکسپریس، پرنس آف پنجاب، سندھ سائیکلون اور طوفانِ کشمیر — یہ سب ٹرک دیکھنے میں بہت شان دار لگتے اور ان پر ہر طرف مختلف شہروں کے خوب صورت مناظر بنے ہوئے تھے، پہاڑ، دریا، آبشار، اونچے درخت اور یادگار عمارتیں جیسے شاہی قلعہ، مینارِ پاکستان، بابِ خیبر، قینچی کا پل، قائداعظم کا مزار — لاریاں کیا تھیں، چلتی پھرتی نمائشیں تھیں رنگین تصویروں کی۔

خیر بخش نے کہا، ''فرنٹیئر میل کل یہاں پہنچے گا تو اسے فوراً ورکشاپ میں بھیجا جائے گا کیوں کہ اس کا انجن تنگ کر رہا ہے، پھر اس کی باڈی کی مرمت بھی کرانی ہے، ان کاموں میں ہفتے بھر سے زیادہ لگے گا۔ اس کے ڈرائیور کو 'پرنس آف پنجاب' کے ساتھ لاہور بھیجا جاسکتا ہے مگر اس کے لیے آپ کو خود بادشاہ خان سے بات کرنا ہوگی۔''

''وہ تو ٹھیک ہے — مگر نور محمد کا مسئلہ کیا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

خیر بخش نے کہا، ''گوٹھ میں اس کی بہن کی شادی ہے بابو ناصر۔''

ناصر نے نور محمد کو بلایا تو وہ آتے ہی ہاتھ جوڑنے لگا، ''سائیں مجھ کو ہر قیمت پر موکل چاہیے، میں نے کوئی دو سال سے گوٹھ کا راستہ نہیں دیکھا — اب بہن کا بیاہ ہے اگر میں اب بھی نہیں گیا تو پھر میری خیر نہیں۔''



ناصر نے اسے اطمینان دلایا کہ وہ بادشاہ خان سے بات کرے گا۔ بادشاہ خان نے بات سنی اور کہا کہ اگر فرنٹیئر میل کا ڈرائیور پرنس آف پنجاب کو لے کر لاہور جاسکتا ہے تو نور محمد کو چھٹی دینے میں کوئی حرج نہیں مگر چھٹی صرف ہفتے بھر کی ہوگی۔

ہفتے بھر بعد ناصر لاری کمپنی کے دفتر میں داخل ہوا تو اس کی میز پر مٹھائی کا ایک بڑا سا ڈبا رکھا تھا۔ ''یہ کیا ہے؟'' اس نے خدا بخش سے پوچھا۔

خدا بخش مسکرایا، بولا، ''نور محمد لایا ہے گوٹھ سے آپ کے لیے۔''

''اچھا۔'' ناصر خوش ہوا، ''کہاں ہے وہ، ذرا بلاؤ اسے، بہن کو بیاہ کر آیا ہے جوان، مبارک باد تو دے دیں اس کو۔''

نور محمد دفتر میں آیا، ''سلام سائیں! دیکھیں میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے، گوٹھ میں بس اتنا ہی ٹھہرا جتنی چھٹی ملی تھی۔''

''بہت مبارک ہو تمھیں — بڑی ذمے داری سے نمٹ گئے۔'' ناصر نے کہا۔

''اللہ سائیں کی مہربانی۔'' نور محمد بولا۔ اس کے ہاتھ میں ایک لفافہ تھا جس میں تصویریں تھیں۔ اس نے ایک تصویر ناصر کی طرف بڑھائی، ''دیکھیں سائیں، نکاح کے بعد مہمانوں کی تصویر۔''

ناصر نے تصویر پر ایک اُچٹتی سی نگاہ ڈالی، ''بڑی بڑی پگڑیوں اور بڑے بڑے گھیر والی شلواروں میں ملبوس بارات کے مہمان دسترخوان پر بیٹھے تھے اور ان کے آگے زردے اور بریانی کے تھال سجے ہوئے تھے۔ بیچ میں دولھا تھا جس کی گردن پھولوں اور کرنسی نوٹوں کے ہاروں کے بوجھ سے جھکی جارہی تھی۔ اچانک مہمانوں کی صف کے پیچھے کھڑے ہوئے ایک شخص کے چہرے کے خدوخال اسے جانے پہچانے سے لگے۔ اس کے ہاتھ میں پانی کا جگ تھا اور وہ مہمانوں کو پانی پلا رہا تھا۔

''سائیں راول!'' ناصر کے منہ سے بے اختیار سائیں راول کا نام نکلا۔

''یہ شخص کون ہے، نور محمد — اور وہاں کیا کرتا ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

نور محمد نے کہا، ''مجھے تو پتا نہیں مگر میں اپنے چاچا سے پتا کر کے بتا سکتا ہوں، وہ

میرے ساتھ ہی کراچی آیا ہے، کچھ دنوں کو۔"

دوسرے دن نور محمد اپنے چاچا کو ساتھ لے آیا، "لیں صاحب، چاچا علی محمد سے ملیں، اس سے جو پوچھنا ہے، پوچھ لیں، یہ ادا مٹھل کو اچھی طرح جانتا ہے۔"

"کون ادا مٹھل؟" ناصر نے پوچھا۔

"ارے وہی آدمی جس کی تصویر کے بارے میں آپ پوچھ رہے تھے۔" نور محمد بولا۔

"اچھا تو اس کا نام مٹھل ہے۔" ناصر نے کہا، "مجھے اس کی شکل اپنے ایک جاننے والے سے ملتی جلتی لگی، اس لیے میں نے سوچا کہ —"

"کون سائیں —؟" نور محمد کا چاچا بیچ میں بول پڑا، "کہیں آپ سائیں راول کو تو نہیں پوچھ رہے، وہ مٹھل کا بڑا بھائی ہے اور ابھی تھوڑے دن پہلے گوٹھ واپس آیا ہے۔"

"ہاں ہاں وہی —" ناصر خوشی سے اُچھل پڑا، "میں اسی کو تو ڈھونڈ رہا ہوں، پہلے اس کا ایک چائے خانہ تھا سپر ہائی وے پر۔"

"ٹھیک کہا آپ نے —" نور محمد کا چاچا بولا، "پہلے وہ وہیں پر تھا۔"

ناصر نے علی محمد کو کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور نور محمد سے کہا کہ وہ اپنے چاچا کے لیے چائے پانی کا بندوبست کرے۔" پھر وہ علی محمد کے برابر میں بیٹھ گیا اور بولا، "آپ کو پتا نہیں مجھے اس وقت کتنی خوشی ہو رہی ہے آپ سے مل کے، مجھے سائیں راول کی بڑی تلاش تھی، میں ان سے فوراً ملنا چاہتا ہوں۔"

چاچا علی محمد نے ٹھنڈا سانس بھرا اور برلا، "آپ اس سے مل کر کیا کریں گے صاحب۔ اس کا تو متھا ہی گھوم گیا ہے، بڑی آفت آئی ہے ان بے چاروں پر۔"

"کیا ہوا اُنھیں؟" ناصر نے گھبرا کے پوچھا۔

"لمبی کہانی ہے صاحب!" علی محمد نے کہا، "آپ تو جانتے ہیں ہمارے علاقے میں وڈیروں کا حکم چلتا ہے یا ڈاکوؤں کا — دونوں برابر ہیں! سائیں راول کے ساتھ دونوں نے ظلم کیا ہے۔"

ناصر نے پریشان ہو کے کہا، "مگر ہوا کیا؟ کچھ بتاؤ تو — نوری کہاں ہے اور کیسی ہے؟"



علی محمد نے ناصر کو غور سے دیکھا، "اس کی بیٹی نا — بس اس کی وجہ سے تو ساری مصیبت آئی، پہلے وڈیرا اس سے زبردستی شادی کرنے کی ضد باندھے ہوئے تھا۔ ایک رات اس نے نوری کو اپنے باپ کے ساتھ اُٹھوا دیا۔ اس کے بندے زبردستی دونوں کو گوٹھ لے آئے۔ یہ کارروائی اس کے خاص آدمی قادر بخش کھوسو نے اپنے کارندوں کے ساتھ مل کے کی مگر جب وہ واپس آ رہے تھے، ان کی مڈبھیڑ کچا ڈاکو کے گروہ سے ہوگئی۔ آپ تو جانتے ہوں گے، یہ کچا ڈاکو کون ہے۔ ارے وہی ماچھی ڈاکو جس نے پورے کچے کے علاقے میں لوٹ مار سے دہشت پھیلا رکھی ہے۔ مجال ہے جو رات میں کوئی بس یا موٹر گاڑی بغیر لٹے پٹے ادھر سے گزر جائے۔ چوں کہ وہ کچے کا راجا ہے اس لیے اسے کچا ڈاکو کہتے ہیں اور وڈیرے کو پکا ڈاکو کیوں کہ اس کا گروہ بستیوں میں کارروائی کرتا ہے۔"

"تو پھر ہوا کیا؟" ناصر نے بے تابی سے پوچھا۔

علی محمد نے جواب دیا، "ہونا کیا تھا — دونوں طرف سے گولیاں چلیں، قادر بخش کھوسو اس میں مر گیا اور ایک گولی سائیں راول کی گردن میں لگی مگر وہ زندہ رہا، بس اس کا دماغ پھر گیا — اس کی ساری یادداشت ہی جاتی رہی۔ اب وہ یا تو چپ رہتا ہے یا پھر الٹی سلٹی باتیں کرتا ہے۔"

"اور نوری — ؟ اُسے تو کچھ نہیں ہوا نا؟" ناصر نے سوال کیا۔

"ہاں نوری بچ گئی اور وڈیرے کے آدمی جب اسے لے کر گوٹھ واپس پہنچے تو وڈیرے نے حالات کی سنگینی کو دیکھتے ہوئے نوری کے ساتھ کوئی زبردستی کرنے کے بجائے اسے اس کے چاچا مٹھل کے حوالے کر دیا۔ راول بھی اس کے پاس رہتا ہے مگر بالکل گم سم، کبھی کبھی بولنے کا دورہ پڑتا ہے تو پھر الٹی سلٹی ہانکنے لگتا ہے۔" علی محمد سانس لینے کو رُکا، پھر بولا، "وڈیرے نے نوری کے لیے دوبارہ شادی کا پیغام بھیجا تھا مگر نوری نے کہا کہ جب تک اس کے باپ کی یادداشت واپس نہیں آ جاتی، وہ شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ اب تو دو سال ہونے کے آئے ہیں مگر نوری ٹس سے مس نہیں ہوتی اور سائیں راول بھی ویسے کا ویسا ہی ہے۔"

''کچھ دوا دارو بھی جاری ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''دوا دارو کہاں جناب۔'' علی محمد نے جواب دیا،''ادا مٹھل کی چھوٹی سی پرچون کی دکان ہے، اس کے پاس اتنے پیسے کہاں کہ وہ بھائی کا علاج کرائے، پھر گوٹھ میں ایک بڈھے کھوسٹ حکیم کے علاوہ کوئی ڈاکٹر واکٹر بھی تو نہیں۔''

ناصر علی محمد کو طشتری میں چائے اُنڈیل کے چسکیاں لیتے دیکھتا رہا، پھر بولا،''سائیں راول سے میری پرانی جان پہچان ہے۔ کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی کہ میں اسے گوٹھ سے باہر لا کے اس کا علاج کسی اچھے اسپتال میں کراؤں؟''

علی محمد نے کہا،''اچھا کام تو یہ ضرور ہوگا مگر صاحب اس میں بڑا خطرہ ہے۔ وڈیرے کی اب تک نوری پر نظر ہے۔ سائیں راول اکیلا تو آ نہیں سکتا، اس کے ساتھ نوری کو بھی آنا پڑے گا اور وڈیرا اس بات کو بالکل پسند نہیں کرے گا، دوسری بات یہ بھی ہے کہ ان دونوں کے ساتھ ادا مٹھل کو بھی گوٹھ چھوڑنا پڑے گا۔''

ناصر نے کہا،''دیکھو میں ہر قیمت پر سائیں راول کا علاج کرانا چاہتا ہوں اور اس کے لیے کچھ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ میں اپنے دوستوں سے مشورہ کروں گا، پھر آپ کو بتاؤں گا کہ کیا کرنا ہے مگر آپ کو میرا ساتھ دینا پڑے گا۔''

علی محمد نے ناصر سے مصافحہ کیا اور اس کے گھٹنے چھوئے،''آپ بہت اچھے انسان ہو صاحب، میں تمھارے ساتھ ہوں مگر ذرا احتیاط سے، وڈیرے کو اس سب معاملے کی بھنک نہیں پڑنی چاہیے۔''

ناصر نے کتاب بند کرکے لمبا سا سانس لیا اور اپنے آپ سے کہا، واقعی کتنا نازک معاملہ تھا سارا— اگر بادشاہ خان، پروفیسر عظمت علی، اس کا دوست عمران اور بھابی ویرا اس کے ساتھ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تھا۔

اس نے پھر کتاب کھولی۔

''بادشاہ خان نے ساری بات سنی اور ناصر سے کہا،''میں نے تجھے اپنا بھائی بنایا ہے، میرا بھائی تیری عمر کا تھا جب وہ بلاقصور ایک جھگڑے میں مارا گیا، بدمعاشوں کے ہاتھوں—



مجھے نہیں معلوم وہ کون لوگ تھے، کون سی زبان بولتے تھے، کس پارٹی سے اُن کا تعلق تھا، میرے لیے تو بس وہ سب میرے بھائی کے قاتل تھے۔ تب سے میں ان لوگوں کا دشمن ہوں جو اپنی جیبوں میں دوسروں کے لیے موت کے وارنٹ لیے گھومتے ہیں۔''

اس نے کہا،''ہم سائیں راول کا علاج کرائیں گے، حیدرآباد کے پاس نفسیاتی مریضوں کا ایک اسپتال ہے جس میں میرا ایک جگری دوست کام کرتا ہے، ہم سائیں راول کو وہاں لے کر آئیں گے۔''

''یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' ناصر نے کہا،''گوٹھ سے سائیں راول کا اچانک غائب ہونا شاید وڈیرے کو پسند نہ آئے، پھر نوری اور مٹھل؟''

''تم ان کی فکر مت کرو۔ پورا پلان میں نے سوچ لیا ہے—'' بادشاہ خان بولا، ''اب تم یہ سارا کام مجھ پر چھوڑ دو اور چین کی نیند سوؤ!'' اور ناصر چین کی نیند سو گیا۔ کتاب اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے فرش پر گر گئی۔



# ۲۳

# دعوتِ چنگ

ناصر نے بہت دنوں کے بعد موکھی کے شیشہ خانے کا رُخ کیا تھا، وہ بھی بجل اور راجا کے اصرار پر ـــ بجل کو وہاں دعوتِ چنگ دی گئی تھی تاکہ وہ اپنا ساز بجا کے سامعین کے من کے تار چُھو لے۔ آج وہاں بعض ایسے خوش اندام آنے والے تھے جو اس کی چنگ نوازی کے گرویدہ تھے۔

ناصر پہنچا تو روشنیاں مدھم ہوچکی تھیں اور چنگ کی دُھن تیز تھی۔ بجل چنگ بجاتا تھا تو راجا کا کام صرف سر دھننا رہ جاتا تھا۔ آج سر دھننے والے بھی بہت سے تھے، ان میں بیرونی ملکوں سے آئے ہوئے بہت سے ملاّح اور سرد علاقوں سے آئی ہوئی سیم تن دوشیزائیں بھی شامل تھیں۔ چنگ کے سرمدی نغموں نے ایسا ماحول پیدا کردیا تھا کہ شیشہ خانے کے مہمان بغیر پیے ہی بے خودی کے عالم میں تھے۔

ناصر کو اچانک ایک گوشے میں بنتِ مُنیلا نظر آئی جو اپنی میز پر اکیلی تھی۔ ناصر اس کے پاس چلا گیا، ''ہیلو!'' اس نے بنتِ مُنیلا کو مخاطب کیا۔ اس نے اپنی نشے سے بوجھل آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی، ''خوش آمدید! تم اس دن سندباد کے ساتھ آئے تھے نا؟''

''ہاں!'' ناصر نے کہا، ''ان دنوں وہ سمندر گشت پر نکلا ہوا ہے۔ اس نے جاتے وقت





کہا تھا کہ میں آپ کو بتادوں کہ وہ ایک دن پھر آئے گا، اپنے سفر کی کہانی سنانے۔''

بنتِ مُنیلا مسکرائی، ''جل پریوں کی کہانی ـــ مجھے پتا ہے اس نے اپنی جان جل پریوں اور ساحلی ڈولفنوں میں بانٹ رکھی ہے، وہ بٹا ہوا آدمی اپنی تکمیل چاہتا ہے مگر اسے اپنی منزل کا پتا نہیں ـــ وہ ہمیشہ سفر میں رہے گا۔''

اسی وقت کسی نے ناصر کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ کیلاش رام چندانی تھا، اس کے ہمراہ لتا ڈیسائی بھی تھی۔ دونوں نے اسے اپنی میز پر آنے کو کہا۔

ناصر نے ان کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا، ''بڑا دھواں ہے یہاں۔''

لتا بولی، ''کیوں نہیں ہوگا، یہ لوگوں کے اندر کا دھواں ہے جسے وہ اپنے منہ سے خارج کررہے ہیں۔ دیکھو ہر شخص اپنے اندر آتش فشاں چھپائے بیٹھا ہے۔''

ناصر نے کہا، ''کچھ آگ تو اندرونی ہے مگر یہاں بیرونی آگ کا بھی خاصا معقول انتظام ہے۔ ذرا دیکھیے ـــ نشہ بڑھتا ہے شرابیں جو شرابوں میں ملیں۔''

لتا مسکرائی، ''صرف شراب ہی کافی نہیں، لوگ تو یہاں چرس، ہیروئن، افیون، بھنگ، ایل ایس ڈی یا ایکسٹی کیسی، ہر شکل میں انگارے چباتے ہیں۔''

اچانک ناصر کو ایک طرف عبدالرحمٰن شوقی نظر آیا، ''ارے یہ بھی یہاں ہے۔'' اس نے حیرت سے کہا۔

''کون؟'' کیلاش چونکا۔

''ارے بھئی، ہندوستانی فلمی گیتوں کا چلتا پھرتا اشتہار، ہندی سنیما کے فن کاروں کا پرستار، اور آزادیِ فلسطین کی علم بردار دوشیزہ کا دعوے دار ـــ عبدالرحمٰن شوقی اور کون؟'' ناصر نے کہا۔

''ارے یہ عربی نوجوان ـــ'' کیلاش ہنسا، ''مرجینا تو اسے لفٹ نہیں کراتی، لہٰذا وہ مرجوانا پر جان چھڑکتا ہے۔''

''اچھا!'' ناصر بولا، ''مگر آپ کس خوشی میں یہاں ہیں؟''

''جیسے تم یہاں پائے گئے ہو ـــ'' لتا نے کہا۔

''میں تو بنتِ مُنیلا کو اپنے دوست سندباد جہازی کا پیغام دینے آیا تھا کہ زندہ رہے

اس کے واپس لوٹنے تک، اس کے فراق میں مر نہ جائے، مگر وہ ابھی نہیں مرے گی، وہ مر ہی نہیں سکتی کیوں کہ مرنے کے بعد اسے شراب نہیں ملے گی۔"

لتا ہنسی۔ ناصر نے کہا، "میں پوچھ سکتا ہوں آپ لوگ بس سادہ پانی پر کیوں گزارہ کر رہے ہیں، یہاں شراب کے بغیر بجل جیسا مغنّی بھی آپ کے دل میں نقب نہیں لگا سکتا۔"

کیلاش نے کہا، "یار میں یہاں آیا نہیں، لایا گیا ہوں — یہ جو لیڈی لتا ہیں نا، یہ اپنے اخبار کے لیے ایک تحقیقی رپورٹ پر کام کر رہی ہیں کہ نوجوان عربی نسل کی موجودہ دل چسپیاں کیا ہیں — موصوفہ یہاں سیکریٹ ایجنٹ بن کے آئی ہیں۔"

لتا نے کہا، "ذرا چپ رہو، وہ باگڑ بلّا بیرے سے کچھ کہہ رہا ہے، ذرا سننے دو۔"

"کون سا باگڑ بلّا؟" ناصر حیران ہوا۔

لتا بولی، "اپنی دائیں طرف دیکھو — ایک موٹا سا شخص تمھیں بیرے کے کان میں کچھ کہتا نظر آئے گا۔"

ناصر نے دیکھا، وہ خاصا مسخرہ سا آدمی تھا۔ اس نے سر پر ملّاحوں والی لال ٹوپی اوڑھ رکھی تھی اور کالے ڈھیلے ڈھالے اونچی مہری والے پتلون پر سرخ جرسی پہنی ہوئی تھی۔ اس کے بازو پر نیلے رنگ کے بچھو کا ٹیٹو بھی تھا۔ آنکھیں باہر نکلی ہوئی تھیں جیسے سخت حیرت میں ہوں۔ اب وہ ہاتھ لہرا لہرا کے بیرے کو کچھ سمجھا رہا تھا۔

"مجھے تو یہ کوئی پرانا شرابی لگتا ہے، شرابِ کہنہ کا شوقین۔ اسے تو میرا خیال ہے کہ مرے ہوئے سانپ کے مٹکے والی شراب بھی پلا دو تو وہ گھوڑے کی طرح ہنہناتا رہے گا۔" ناصر نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

کیلاش بولا، "نہیں یار، مجھے تو وہ موٹاپے کا کوئی دائمی مریض لگتا ہے جو یہاں وزن کم کرنے کی ترکیب پوچھنے آیا ہے۔"

"آپ دونوں صاحبان غلط ہیں —" لتا اپنے بالوں کے عظیم الشان چھتے میں کسی نادیدہ شہد کی مکھی کو ٹٹول کے بولی، "یہ خفیہ پولیس کا بندہ ہے، میں اسے جانتی ہوں۔"



٢٤

# پپیتا اور کھجور

ناصر نے بستر پر لیٹ کے پھر پروفیسر عظمت علی کا ناول کھولا۔ نئے باب میں اس شام کا ذکر تھا جب اسے پتا چلا تھا کہ سائیں راول اور نوری کو کوٹری پہنچا دیا گیا ہے۔ اور یہ سب بادشاہ خان کے لمبے ہاتھوں کا کارنامہ تھا۔ اس نے پڑھنا شروع کیا۔

ناصر شام کو لاری کے اڈّے سے نکلنے ہی والا تھا کہ خیر بخش نے اسے بادشاہ کا پیغام دیا کہ وہ ٹھیک ساڑھے چھ بجے برنس روڈ پر صابری نہاری ہوٹل پر پہنچے۔ ناصر نے پہلے ارادہ کیا تھا کہ وہ سرکلر ٹرین سے واپس جائے گا مگر بادشاہ خان کا پیغام ملنے کے بعد وہ پیدل ہی بندر روڈ کی طرف چل پڑا۔ لائٹ ہاؤس کے پاس لنڈا بازار میں دکانوں کے تھڑوں پر بکرے کی کھالوں کی طرح پرانے کپڑوں کے ڈھیر لگے تھے جن کی سیلی ہوئی بُو ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ بعض دکانوں پر گاہک کپڑوں کو ایسے الٹ پلٹ کے دیکھ رہے تھے جیسے ان کا حسب نسب جانچ رہے ہوں۔ پرانے کوٹ اور پتلونیں، اونی جیکیٹس اور اوورکوٹ، عورتوں کے بلاؤز، اسکرٹ اور گاؤن۔

ناصر نے سوچا، غریب لوگ بھی تو پرانے کپڑوں کی طرح ہوتے ہیں، بوسیدہ، استعمال شدہ، بساندے — کوئی عزت والا، ظاہردار بیگ اُن کی طرف دیکھنا بھی پسند نہیں

کرتا لیکن اگر اسی ڈھیر میں اتفاق سے کبھی کوئی چمکتی، جگمگاتی اور کسی انوکھی خوش بو میں بسی ہوئی کوئی ریشمی صورت کسی خوب صورت بلاؤز یا واسکٹ کی طرح ہاتھ لگ جائے تو پھر اسے چھوڑتا بھی نہیں— جیسے وڈیرا نوری کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ وہ دکانوں پر لٹکے ہوئے پرانے ملبوسات کو دیکھتا اپنے آپ سے الجھتا تیزی سے قدم بڑھاتا رہا۔ اسے ہینگروں پر لٹکے کپڑے انسانوں کی طرح لگے۔ ہر ایک کا ایک ماضی تھی اور ہر ایک کی علاحدہ کہانی۔ ناصر نے سوچا، کاش وہ ان کی کہانیاں جان سکتا۔

لنڈا بازار سے ناصر سڑک پار کر کے کاغذ کی منڈی کی طرف چلا گیا۔ بوتل بازار میں بڑی بھیڑ تھی مگر اسے یہ بازار ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ وہاں ہر وقت دکانوں پر ہزاروں قسم کی چھوٹی بڑی خالی بوتلیں سجی رہتی تھیں۔ عجیب عجیب شکلوں والی— صراحی دار گردن والی، گول مٹول، لمبوتری، چپٹی اور چوکور— سفید، نیلے، پیلے، ہرے اور کتھئی رنگ کی چمکیلی بوتلیں اور شیشیاں۔

ناصر نے سوچا، کیسی خوب صورت دنیا ہے یہ! پھر اس نے ایک گاہک کو دکان والے سے گلابی رنگ کی گول پیندے اور صراحی دار لمبی گردن والی ایک بوتل کی فرمائش کرتے سنا۔ ارے، ناصر نے سوچا، یہ بوتلیں ہیں کہ عورتیں— ہر کوئی اپنی خواہش کا منی پلانٹ اپنی پسندیدہ بوتل میں سجانا چاہتا ہے۔ وہ خود بھی تو اپنے دل میں خواہش کی سبز بیل چھپائے اپنی بوتل کی تلاش میں گھوم رہا ہے۔

لاحول ولا قوۃ— کیا احمقانہ سا خیال ہے— ناصر نے سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔ آرام باغ سے اس نے بس پکڑی اور اگلے اسٹاپ پر اُتر گیا۔ نہاری والے صابری ہوٹل پر پہنچتے پہنچتے سات بج چکے تھے مگر بادشاہ خان اسے میز پر انتظار کرتا نظر آیا۔ اس کے ساتھ وہی شخص تھا جس کی تصویر اس نے نور محمد ڈرائیور کے پاس دیکھی تھی۔

بادشاہ خان نے اس کا تعارف کرایا، ''مٹھل سائیں! تمھارے راول چاچا کے چھوٹے بھائی، میں نے انھیں خاص طور پر کراچی بلوایا ہے۔''

ناصر نے سائیں مٹھل سے ہاتھ ملایا۔ بادشاہ خان نے کہا، ''تمھارے لیے ایک خوش خبری یہ بھی ہے کہ سائیں راول اور نوری ہمارے پلان کے مطابق کوٹری پہنچ چکے ہیں۔''



''کیا— ؟'' ناصر کی آنکھیں حیرت سے پھٹ گئیں۔ بادشاہ خان نے چپکے چپکے نہ صرف پورا منصوبہ تیار کیا تھا بلکہ اس پر عمل درآمد بھی کیا جا چکا تھا۔

''یہ کیسے ہوا؟'' ناصر نے پوچھا۔

ادا مٹھل نے ناصر کا ہاتھ تھام کر کہا، ''بادشاہ خان نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔ نور محمد کے چاچا کے ذریعے اس نے مجھے پیغام بھیجا تھا کہ سائیں راول کو اسپتال میں داخل کرانے کے لیے ضروری ہے کہ وڈیرے کے آدمیوں کو خبر ہونے سے پہلے ہم تینوں گوٹھ سے نکل آئیں— اور یہی ہوا۔''

''مگر آپ کی تو چلتی ہوئی دکان تھی۔'' ناصر نے پوچھا، ''اس کے بند ہونے سے وڈیرے کو شک نہیں ہوگا؟''

''دکان میں نے بیچ دی ہے مگر نئے مالکوں سے کہا ہے کہ وہ ابھی کسی کو میرے گوٹھ سے چلے جانے کی خبر نہیں بتائیں گے۔'' مٹھل نے کہا۔

وہ کچھ دیر چپ رہا، پھر بولا، ''ہم لوگ بہت احتیاط سے وہاں سے نکلے، پہلے بس کے ذریعے اور پھر حبیب کوٹ سے ریل گاڑی سے سکھر کے راستے حیدرآباد پہنچے۔'' وہ سانس لینے کو رُکا، پھر بولا، ''سکھر کے ریلوے اسٹیشن پر ہمیں وڈیرے کا ایک آدمی نظر آیا تھا مگر ہم اُسے جل دے کر بھوسا لین میں کھڑی ایک مال گاڑی میں سوار ہو گئے۔ یہ بھوسے سے بھری ہوئی ویگنیں تھیں۔ ہم تینوں بھوسے کے اندر چھپے رہے اور جب سیٹھارجہ اسٹیشن پر گاڑی رُکی تو ہم پھر مسافروں کی گاڑی میں سوار ہوئے اور حیدرآباد میں اُتر گئے جہاں بادشاہ خان نے نور محمد کو ہمیں لینے کے لیے بھیج رکھا تھا۔ وہ گاڑی کھاتا کے ایک ہوٹل میں ہمارے واسطے ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ سفر پورے تین دنوں اور تین راتوں میں پورا ہوا۔''

بادشاہ خان مسکرایا، ''دیکھ لیا، بادشاہ خان نے کہا تھا نا کہ وہ تمھیں چھوٹا بھائی سمجھتا ہے، اس لیے تمھاری ہر طرح مدد کرے گا۔''

ناصر نے پوچھا، ''اب سائیں راول کا کیا ہوگا؟''

بادشاہ خان نے کہا، ''اسے گڈو کے قریب دماغی اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے،

جہاں میرے دوست ڈاکٹر فرمان احمد نے یقین دلایا ہے کہ اس کی اچھی طرح دیکھ بھال کی جائے گی۔"

"اور نوری؟" ناصر نے سوال کیا۔

"نوری ابھی سائیں مٹھل کے ساتھ کوٹری میں ہے — میرے فارم ہاؤس میں — اب سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

ناصر نے چاہا، پوچھے، کیا سب ٹھیک ہو جائے گا، مگر پھر یہ سوچ کے چپ رہا کہ سائیں مٹھل کیا سوچے گا۔

"فارم ہاؤس محفوظ جگہ تو ہے نا؟" ناصر نے پھر سوال کیا۔

"سو فی صد محفوظ!" بادشاہ خان نے جواب دیا، "دو مسلح گارڈ وہاں چوبیس گھنٹے پہرہ دیں گے۔"

"کیا میں نوری سے مل سکتا ہوں؟" ناصر نے کہا۔

"ابھی نہیں بے صبرے بچے۔" بادشاہ خان نے ہنس کے کہا، "نوری سے تمھاری ملاقات اسپتال میں ہوگی جہاں وہ سائیں راول سے ملنے آئے گی۔"

ناصر کچھ دیر چپ چاپ بیٹھا رہا، پھر جذبات سے مغلوب ہو کے بولا، "میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ آپ کے مجھ پر پہلے ہی اتنے احسانات ہیں۔"

بادشاہ خان نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، "اس کی ضرورت نہیں۔ فی الحال سائیں مٹھل نوری کے پاس کوٹری میں رہیں گے، لیکن کچھ دنوں کے بعد جب سائیں راول کچھ بہتر ہو جائیں گے اور نوری کے ساتھ تمھارا نکاح ہو جائے گا تو تم سب کراچی آ جانا — سائیں مٹھل کے لیے بھی میں نے ایک مناسب نوکری کا انتظام کر رکھا ہے۔"

بیرا ان کے سامنے نہاری کی پلیٹیں اور گرما گرم روٹیاں میز پر رکھ کے چلا گیا۔ بادشاہ خان نے کہا، "سائیں مٹھل کو فوراً ہی کوٹری واپس جانا ہے، لہٰذا اب کھانے میں دیر کی بالکل گنجائش نہیں۔"

ناصر نے کتاب بند کر کے اپنے سینے پر رکھی اور خود سے کہا، یہاں تک تو وہ باتیں تھیں



جو پروفیسر عظمت علی کو پتا تھیں مگر انھیں یہ بات میں نے کبھی نہیں بتائی تھی کہ میرے لیے یہ سارے واقعات اتنے غیر متوقع اور حیران کن تھے کہ میں ساری رات سو نہیں پایا اور سب سے چھپ کے کوٹری جانے کا منصوبہ تیار کرتا رہا۔

روز کی طرح اس شام بھی بھتیجے عرفان کے ساتھ کیرم اور لوڈو کی بازیاں جمیں مگر ان میں اس کا دل نہیں لگا۔ عرفان اگرچہ چھٹی جماعت میں تھا مگر کیرم کے کھیل میں وہ شاید پورے اسکول کا چیمپیئن تھا کیوں کہ ناصر سمیت گھر کا کوئی فرد اسے ہرا نہیں سکتا تھا اور لوڈو میں تو اسے وہ گُر بھی آتا تھا کہ موقع دیکھ کے مخالف کھلاڑی کی گوٹوں کو کس طرح اغوا کر کے کہیں سے کہیں پہنچا دیا جائے۔ وہ عرفان کی اُن چھوٹی چھوٹی بے ایمانیوں کے وقت مسکرا کے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا۔ ناصر کو لگا کہ وہ اور اس کے دوست بھی وڈیرے کے ساتھ لوڈو کھیل رہے تھے۔ گوٹیں اغوا ہو رہی تھیں اور ایک دوسرے سے چھپا کے مختلف منزلوں تک پہنچائی جا رہی تھیں۔ عجیب کھیل ہے یہ زندگی بھی — اس نے سوچا۔

ناصر نے پھر سے کتاب اٹھائی۔

بادشاہ خان اتوار کے دن صبح ہی صبح ناصر کے گھر آ دھمکا، "چلو شہزادے — آج تمھیں کوٹری کی سیر کراتے ہیں۔"

"کہاں کی؟" ناصر نے بن کے پوچھا۔

"خدا کی پناہ! تمھاری یادداشت بھی جاتی رہی ہے — عشق میں یہی ہوتا ہے —" بادشاہ خان ہنسا، "خیر چلو اسپتال ہی تو چلنا ہے، تمھارا طبی معائنہ بھی کراؤں گا وہاں۔ دو ڈاکٹر موجود ہوں گے۔ ایک تو سائیں راول کا ڈاکٹر میرا دوست فرمان احمد اور دوسری سائیں راول کی بیٹی — ان دونوں معالجوں سے مل کے یقیناً تمھیں خاصا افاقہ ہوگا۔"

جب ناصر بادشاہ خان کے ساتھ اسپتال میں داخل ہوا تو سائیں راول جنرل وارڈ کے آخری بیڈ پر بڑے آرام سے لیٹا تھا۔ آرام سے اس لیے کہ اسے پرانی کوئی بات یاد نہ تھی۔ سارے چہروں میں اسے صرف نوری کا چہرہ کچھ مانوس نظر آتا تھا کیوں کہ صرف اسی کو دیکھ کے اس کے لبوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں پہچان کی چمک اُبھرتی تھی۔

ڈاکٹر فرمان کا خیال تھا کہ یہ کیفیت عارضی ہے مگر اسے صحت یاب ہونے میں کئی مہینے لگ سکتے ہیں۔ اس وقت اس کے پاس سائیں مٹھل اور نوری پہلے سے موجود تھے۔ ناصر کو دیکھ کر نوری ایک کونے میں سمٹ گئی۔ اس نے خود کو اجرک کی چادر میں اس طرح چھپا رکھا تھا کہ چہرہ بھی پورا نظر نہ آتا تھا مگر ایک بار جب اس نے پلٹ کے ناصر کو دیکھا تو اس کی آنکھوں میں اسے اپنائیت اور ممنونیت کی روشنیاں جھلملاتی نظر آئیں۔

سائیں مٹھل نے کہا، ''ڈاکٹر بولتا ہے کہ سائیں راول ٹھیک ہو جائے گا۔''

ناصر نے آگے بڑھ کے سائیں راول کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا، ''میں آگیا ہوں چاچا — اب تجھے کوئی فکر نہیں ہونی چاہیے۔''

سائیں راول اسے ٹکر ٹکر دیکھتا رہا مگر کچھ بولا نہیں۔ نوری چادر میں منہ چھپا کے چپکے چپکے سسکیاں بھرنے لگی۔

بادشاہ خان نے کہا، ''بیٹی ہمت سے کام لو، تمھارا بابا ضرور ٹھیک ہو جائے گا، پھر یہ بھی تو دیکھو اس کی دیکھ بھال کے لیے کتنے دوست یہاں جمع ہیں۔''

نوری نے دھیرے سے کہا، ''مجھے آپ لوگوں کی مدد نے پھر سے زندہ کر دیا ہے، اللہ سائیں آپ کو...!''

بادشاہ خان نے آنکھ کے اشارے سے سائیں مٹھل کو باہر آنے کو کہا۔ دونوں باہر چلے گئے تو ناصر اور نوری سائیں راول کے پاس اکیلے رہ گئے۔

کچھ دیر خاموشی رہی، پھر ناصر نے کہنا شروع کیا، ''مجھے یقین نہیں آتا نوری کہ تم اس وقت میرے سامنے موجود ہو — سائیں راول بھی — میں نے تم دونوں کو تقریباً کھو دیا تھا۔''

نوری نے اپنی سیاہ آنکھیں اوپر اٹھائیں اور بولی، ''مجھے بھی لگتا ہے جیسے کوئی خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس رات کے بعد تو میری نیند ہی غائب ہو گئی تھی۔ وہ رات عجیب تھی جب ہم پر آسمان ٹوٹ پڑا تھا۔ میں نے دیکھا تھا، وہ لوگ تمھیں سوتے میں قتل کر دینا چاہتے تھے۔''

ناصر نے کہا، ''مگر اللہ ہمارے ساتھ تھا، وہ اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔'' وہ دونوں دھیرے دھیرے باتیں کرتے رہے اور سائیں راول لیٹا بے نیازی سے مسکراتا رہا جیسے سب



سن رہا ہو اور دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہو۔ نوری نے سائیں راول کے بیڈ کے برابر والی میز پر سے ایک طشتری اٹھا کے ناصر کو دی۔ پلیٹ میں پپیتے کے قتلے تھے اور ان کے ساتھ سکھر کی پیلی رسیلی کھجوریں رکھی ہوئی تھیں۔

اسپتال سے واپسی پر بادشاہ خان نے کہا، ''اگلے جمعے کو تمھاری شادی ہے ناصر، میں نے سائیں مٹھل سے بات کر لی ہے۔ وہ بھی یہی کہتا ہے کہ اس طرح نوری محفوظ ہو جائے گی، آخر سائیں راول کی بھی تو یہی خواہش ہے۔''

ناصر نے کہا، ''اتنی جلدی، میں تو اماں، بھائی اور بھابی کو بھی تو...''

بادشاہ خان نے کہا، ''ہاں تو انھیں فوراً بتا دو اور اپنے دوست عمران کو بھی — نکاح کوٹری میں میرے فارم ہاؤس میں ہوگا اور انھیں فکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، سب انتظام ہو جائے گا۔''

ناصر نے کتاب پر سے نظریں ہٹائیں، واقعی کتنی عجیب بات تھی۔ سب کچھ کتنی آسانی سے ہو گیا۔ اماں، بھائی، بھابی عرفان اور عمران، ویرا بھابی اور پروفیسر عظمت علی سب کے سب اس کے نکاح کی تقریب میں موجود تھے۔ بادشاہ خان نے ناصر خان کا سرپرست اور سائیں مٹھل نے نوری کا بزرگ بن کے وہ سب کر دکھایا جو کچھ دن پہلے ممکن ہی نہیں تھا۔

ناصر نے کتاب بند کر کے سرہانے رکھی اور سو گیا۔



## ۲۵

# بخیلی ہے یہ 'قزّاقی' نہیں ہے

ناصر، فریدون خستہ تن کے لاریوں کے گودام میں بیٹھا سعودی عرب اور قطر سے آئے ہوئے ڈرائیوروں سے ان کے روزنامچے سن رہا تھا کہ اچانک موبائل کی گھنٹی بجی۔ اس نے فون کان سے لگایا۔

''ہیلو!''

دوسری طرف مرجینا تھی، ''کیا بات ہے، تم کئی دن سے دکھائی نہیں دیے، آؤ تمھیں کسی سے ملوانا ہے۔''

''کس سے ___؟'' ناصر نے پوچھا۔

''یہاں آؤ تو ملواؤں، بہت اہم شخصیت ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

ناصر ہنسا، ''سچ مچ میں اہم ہے یا میری طرح تم سے مل کے اہم ہوگئی ہے!''

مرجینا نے کہا، ''خود آ کے دیکھ لو، آج ہی ہم لوگ الف لیلہ تھیٹر کا نیا کھیل پیش کر رہے ہیں، موقع ہو تو اسے بھی دیکھنا۔''

''ضرور، ضرور۔'' ناصر نے کہا۔

اس نے بات ختم کی تو ایک کارندے نے کہا، ''فریدون ارباب آپ کو یاد کر رہے ہیں۔''





ناصر لپک جھپک کے خستہ تن کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی فرشی نشست پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔

''آؤ، رفیق، آؤ___ تمھارے لیے اچھی خبر ہے۔'' اس نے ہانک لگائی اور ایک ملازم کو قہوہ لانے کو کہا۔

ناصر، خستہ تن کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے سامنے رکھے لکڑی کے صندوقچے میں ہاتھ ڈالا اور ایک پاسپورٹ نکالا، ''دیکھو میں نے تمھارے لیے کیسا پکا انتظام کیا ہے۔'' اس نے ہرا پاسپورٹ لہرایا۔

''یہ کیا ہے؟'' ناصر حیران ہوا۔

''پاسپورٹ ہے میرے بھائی، پکا، تمھارے ملک کا، اس پر ویزا بھی لگا ہوا ہے۔ بس تصویر بدلنا پڑے گی؟'' وہ بولا۔

''کیا___؟'' ناصر آنکھیں پھاڑ کے بولا، ''تصویر بدلنا پڑے گی، کیا مطلب؟''

''یہی کہ تمھاری تصویر لگے گی اس تصویر کی جگہ!'' خستہ تن نے کہا۔

ناصر نے پاسپورٹ ہاتھ میں لیا۔ پاسپورٹ احمد علی نامی کسی شخص کا تھا، تصویر بھی اس کی تھی، ''مگر یہ تو احمد علی کا پاسپورٹ ہے!'' اس نے کہا۔

''ہاں۔'' خستہ تن بولا، ''مگر وہ بے چارہ اب اس دنیا میں نہیں___ مگر پاسپورٹ تو ہے نا۔ ڈرو نہیں یہ بھی ہمارا آدمی تھا۔ مر گیا بے چارہ ایک حادثے میں___ میں نے سوچا یہ پاسپورٹ تمھارے کام آجائے گا، تمھارا ابھی تو مسئلہ ہے نا پاسپورٹ کا۔''

''ارے___ مگر نام۔'' ناصر نے احتجاج کیا۔

''نام___ نام وہی احمد علی___ کیا فرق پڑتا ہے___ اور تمھیں بھی کیا فرق پڑے گا، گھر میں ناصر، گھر سے باہر احمد علی، سب چلتا ہے آج کل! کچھ دنوں بعد اپنا نام ناصر احمد علی کروا لینا، سب کچھ ممکن ہے۔'' خستہ تن ہنسا۔

ناصر بگڑ کے بولا، ''نہیں ارباب، میں یہ کام نہیں کرسکتا۔ ٹھیک ہے، ابھی میرے پاس قانونی کاغذات نہیں لیکن کچھ دنوں بعد ہو جائیں گے، ایک دوست کہہ رہا تھا کہ حکومت جلد

ہی غیر قانونی لوگوں کے لیے عام معافی کا اعلان کرنے والی ہے۔ میں انتظار کرلوں گا۔"

خستہ تن برا مان گیا، "تمھارا مرضی بابا، ہم نے تو سوچا تھا تمھارا کام بن جائے گا۔ راجا اور بیجل بولا تھا کہ اس کو پاسپورٹ دلانا ہے اور ہم نے سوچا تم کو پاسپورٹ مل جائے گا تو ہم تم کو کاروبار کے لیے باہر بھیجے گا۔ افغانستان یا پھر عراق۔ لوگ بہت مال بنا رہا ہے ادھر۔ امریکا بادشاہ زندہ آباد۔"

ناصر نے کہا، "سوری ارباب! ابھی میں اس مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتا۔"

"کوئی بات نہیں۔" خستہ تن خشک لہجے میں بولا، "اچھا اب سعودیہ نیا مال جانے والا ہے، اس بار راجا صاحب بھی ساتھ جائے گا، ذرا خیال رکھو، تین دن میں گاڑی تیار ملنا چاہیے۔"

"ضرور——!" ناصر نے جواب دیا اور تیزی سے باہر نکل گیا۔

الف لیلہ تھیٹر کی کینٹین میں مرجینا، ناصر کا انتظار کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک دوہرے بلکہ تہرے بدن کا گورا چٹا شخص بیٹھا تھا۔ اس نے گہرے سبز رنگ کا سفاری سوٹ پہن رکھا تھا، سر پر یاسر عرفات مارکہ لال چار خانے والا رومال اور آنکھوں پر موٹے فریم والا چشمہ۔ "ان سے تم پہلے کبھی نہیں ملے ہو گے!" مرجینا نے ناصر سے کہا، "مصطفیٰ غوباش۔ فلسطینی تحریک کے ایک اہم رکن—— یہاں کچھ دن ٹھہر کے تنظیم کے معاملات کا جائزہ لیں گے اور تحریک کے لیے مالی عطیات کی مہم چلائیں گے۔ انھیں شیخوں، بڑے بڑے تاجروں اور مقامی کالجوں اور جامعات کے طلبہ اور طالبات سے ملنا ہے۔"

"تو——؟" ناصر بولا، "میں کیا کرسکتا ہوں اس سلسلے میں؟"

"تم بہت کچھ کرسکتے ہو۔ میں جانتی ہوں!" مرجینا بولی، "تم بہت سے لوگوں سے واقف ہو۔ تمھارے پرانے کارخانے کے مالک ابوعبید بھی بہت بااثر شخص ہیں، ان کے ذریعے اوپر والوں تک پہنچا جاسکتا ہے، اس کے علاوہ انھیں ایک ایسا ٹیکسی ڈرائیور بھی چاہیے جو رات دن ان کے ساتھ رہے۔"

ناصر نے کہا، "ایک آدمی ہے میرے پاس، تم بھی ضرور اسے جانتی ہوگی، قابلِ اعتماد بندہ ہے۔"



"کون؟" مرجینا نے پوچھا۔

"بھئی وہی ثابت خان اور کون—— وہ جو سندباد جہازی کو ساتھ لیے پھرتا ہے۔ آج کل سندباد تو سفر میں ہے، لہٰذا...!"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" مرجینا نے کہا، "یہ مسئلہ تو حل ہوا۔"

"مشکور!" غوباش نے کہا، "تم جانتے ہو ہمیں کتنی ضرورت ہے تم سب کی مدد کی!"

ناصر نے کہا، "جب مرجینا کی پوری مدد آپ کو حاصل ہے تو سمجھیں اس پورے شہر کی مدد آپ کے پاس ہے۔" پھر وہ مرجینا کی طرف مڑا اور بولا، "آج کا کھیل کون سا ہے؟"

مرجینا نے مسکرا کے جواب دیا، "اے اخی—— "کوہِ ندا!"

"وہی کوہِ ندا؟ جہاں کوئی پکارتا ہے یا اخی—— یا اخی—— مگر یہ کوہِ ندا ہے کہاں؟" ناصر نے پوچھا۔

مرجینا بولی، "ہر اس جگہ جہاں بھائی کے ہاتھوں بھائی قتل ہو رہا ہے—— پاکستان، افغانستان، عراق، فلسطین—— مقتول قتل کے وقت قاتل کو دیکھتا ہے اور تڑپ کے پکارتا ہے—— یا اخی، یا اخی!"

الف لیلہ تھیٹر سے نکل کے ناصر سیدھا ابوعبید کی طرف گیا جو اپنے دفتر میں موجود تھا۔ ناصر نے اسے مصطفیٰ غوباش کے بارے میں بتایا کہ وہ اس سے ملنے کا خواہش مند ہے تاکہ مصیبت زدہ فلسطینیوں کے لیے امدادی عطیات کی مہم کے بارے میں مشورہ کرسکے۔

ابوعبید نے کہا، "اس سے کہو کہ وہ ہلالِ احمر کے حکام سے ضرور ملے ویسے بھی یہاں کئی سرکاری تنظیمیں پہلے سے فلسطینیوں کے لیے امدادی کاموں میں حصہ لے رہی ہیں۔" پھر اس نے توقف کیا اور بولا، "میں خود بھی اس معاملے میں جو ہوسکے گا، کروں گا مگر ابھی میں 'سلطان البحر' کے معاملے میں الجھا ہوا ہوں جسے عدن کے ساحل کے پاس صومالی قزاقوں نے اغوا کرلیا ہے۔"

"کیا؟" ناصر پریشان ہوا، "یہ کب ہوا؟"

"دو تین دن پہلے۔" ابوعبید نے کہا، "اس پر عملے کے پندرہ افراد سوار ہیں اور لاکھوں

ڈالر مالیت کا تجارتی سامان جس میں الیکٹرانک آلات اور مشینیں اور تعمیراتی لکڑی شامل ہے، لدا ہوا ہے۔ 'سلطان البحر' یہ سامان لے کر کینیا اور تنزانیہ جا رہا تھا۔''

ناصر نے پوچھا، ''کسی نے کوئی مزاحمت نہیں کی اور وہ جو قریبی سمندروں میں بے شمار ملکوں کی بحریہ اپنے جہازوں سمیت موجود ہے، اس نے کوئی مدد نہیں کی۔''

ابوعبید نے کہا، ''اصل میں اب بحری قزاق بھی بہت ہوشیار ہو گئے ہیں۔ پہلے زمانے کا دو انسانی ہڈیوں اور کھوپڑی والا جھنڈا جولی راجرز (Jolly Rogers) ان کی کشتیوں پر لہراتا ہے، نہ وہ کسی کو سنبھلنے کا موقع دیتے ہیں۔ وہ کھلے سمندر میں اپنی چھوٹی چھوٹی تیز رفتار کشتیوں پر اچانک نمودار ہوتے ہیں اور اسلحے کے زور پر تجارتی جہازوں کو یرغمال بنا لیتے ہیں۔ 'سلطان البحر' کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ قزاق جدید ترین خودکار ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ بات بات پر فائرنگ اور مہلک راکٹ داغنے کے لیے تیار۔ بھلا کوئی مزاحمت کہاں سے کرتا۔ لہٰذا وہ آئے، انھوں نے دیکھا اور انھوں نے فتح کر لیا، اب جہاز ان کے قبضے میں ہے۔''

''اب وہ جہاز کہاں ہے؟'' ناصر نے پوچھا۔

ابوعبید نے کہا، ''قزاق پہلے اسے شمالی صومالیہ کی بندرگاہ 'بوسے سو' لے گئے اور 'آئیل' جہاں وہ ساحل پر لنگر انداز ہے اور قزاقوں کا گروہ اس کی رہائی کے لیے تاوان کی رقم کا مطالبہ کر رہا ہے۔ وہ پچاس لاکھ ڈالر پر اصرار کر رہے ہیں مگر یہ رقم اتنی زیادہ ہے کہ اسے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، ہم چاہتے ہیں کہ یہ رقم آدھی ہو جائے۔''

ناصر نے کہا، ''میں نے سنا ہے کہ یہ لوگ بڑے خر دماغ ہوتے ہیں اور بڑی مشکل سے تاوان کی رقم کم کرنے پر راضی ہوتے ہیں، بقول شخصے کہتے ہیں:

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ 'قزاقی' نہیں ہے

ابوعبید نے کہا، ''مذاکرات ابھی جاری رہیں، دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ ہو سکتا ہے تاوان کی رقم لے کر مجھے خود وہاں جانا پڑے۔ انھوں نے دھمکی دی ہے کہ اگر کل دس بجے دن تک رقم ان تک نہ پہنچی تو وہ جہاز کے عملے کے ارکان کو ایک ایک کر کے ذبح کرنا شروع کر دیں



گے، کپتان کا پہلا نمبر ہوگا۔''

''واقعی بڑی آفت ہے یہ۔'' ناصر بولا۔

''یاد ہے، ایک بار سندباد جہازی نے بتایا تھا کہ سمندروں میں 'مارڈ' نامی ایک عفریت رہتا ہے جو ملاحوں سمیت جہازوں کو غرق کر دیتا ہے، میں اسے ملاحوں کی بڑ سمجھتا تھا مگر اب پتا چلا یہ سچ ہے، یہ بحری قزاق ہی تو 'مارڈ' ہیں۔''

''تو اب آپ کیا کریں گے؟'' ناصر نے پوچھا۔

''تاوان کی رقم انھیں ہر قیمت پر پہنچانا ہوگی۔'' ابوعبید نے کہا۔

''مگر یہ رقم آپ انھیں پہنچائیں گے کیسے؟'' ناصر بولا۔

''ہیلی کاپٹر کے ذریعے اور کیسے۔ اس کے علاوہ کوئی طریقہ نہیں، اس کے لیے بھی انھوں نے ایک پورا طریقۂ کار بتایا ہے۔ ہیلی کاپٹر جہاز کے اوپر تین چکر لگائے گا اور پھر وائرلیس فون پر قزاقوں کے لیڈر سے بات کر کے ایک عمودی کیبل کے ذریعے تاوان کی رقم کا تھیلا جہاز کے عرشے پر لٹکایا جائے گا۔ رقم قزاقوں تک پہنچانے کے بعد ہیلی کوپٹر واپس چلا جائے گا اور اس تمام عرصے میں وہ قزاقوں کے راکٹوں کی زد میں رہے گا۔ تھیلے میں موجود رقم کی تصدیق ہو جانے کے بعد قزاق جہاز کے عملے کو رہا کر دیں گے اور کپتان کو اجازت ہوگی کہ وہ جہاز کو جہاں چاہے لے جائے۔ مگر اس ساری کارگزاری کے دوران میرا بس یہی کام ہوگا کہ مصلیٰ بچھا کے بیٹھ جاؤں اور جہاز کی بخیریت واپسی کی دعا کرتا رہوں۔''

اسی وقت ابوعبید کا موبائل فون بجا۔ وہ فوراً اٹھ کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جاتے جاتے اس نے اشارے سے بتایا کہ انھیں لوگوں کا پیغام ہے۔ انسانی جانوں کی پھر سے نیلامی شروع ہو گئی۔



# ۲۶

# دشمنوں کی شام

ناصر اور نوری کی شادی ہوئے ایک مہینا ہوگیا تھا اور نوری ابھی تک کوٹری میں بادشاہ خان کے فارم ہاؤس میں رہ رہی تھی۔ ناصر نے مہینے بھر کی چھٹی لے رکھی تھی۔ کوٹری میں رہنے کا فائدہ یہ تھا کہ سائیں راول سے اسپتال میں روزانہ ملنے کی آسانی تھی۔ سائیں راول پہلے سے بہتر تھا اور اس کی آنکھوں کے چراغوں میں پہچان کی لَو پہلے سے تیز ہوگئی تھی۔ وہ دونوں کو ساتھ دیکھ کے مسکرانے لگتا تھا۔

ناصر نے کتاب سے نظریں ہٹا کے ایک لمحے کے لیے سوچا، کاش یہ پریوں کی کہانی کی طرح کا کوئی قصہ ہوتا جس میں شادی کے بعد شہزادے اور شہزادیاں ہمیشہ ہنسی خوشی رہتے نظر آتے ہیں مگر ان کی شادی تو گویا دکھوں کے ایک نئے سلسلے کا آغاز تھی۔

اس نے دوبارہ کتاب پر نظریں جما دیں۔

اور وہ بڑی منحوس صبح تھی جب اچانک بادشاہ خان اپنی پجیرو میں فارم ہاؤس پر آیا اور دونوں سے کہا کہ وہ فوراً اپنا سامان باندھیں اور کراچی کے لیے روانہ ہوجائیں۔ اس نے ناصر کو کچھ نہیں بتایا مگر اس کے چہرے پر تفکرات کے بادل صاف بتا رہے تھے کہ معاملہ بہت سنگین ہے۔





"کیا بات ہے بادشاہ خان—؟" ناصر نے پوچھا۔

"بات تو بعد میں پوچھنا، اس وقت تم دونوں کو فوراً کُوچ کرنا ہے۔ فی الحال تین ہٹی پر اپنے گھر میں ٹھہرو گے جب تک کوئی دوسرا انتظام نہیں ہوجاتا، دونوں گارڈ تمھارے ساتھ جائیں گے۔" بادشاہ خان نے کہا۔

ناصر نے کہا، "کیوں نہ ہم دونوں جانے سے پہلے سائیں راول سے مل لیں اسپتال میں؟"

بادشاہ خان، ناصر کو ایک طرف لے گیا اور چپکے سے بولا، "بڑی بُری خبر ہے دوست، کل رات اسپتال پر حملہ ہوا ہے، کچھ لوگوں نے جنرل وارڈ میں داخل ہو کے اندھا دھند گولیاں چلائیں جس سے سائیں راول اور ادا مٹھل دونوں— مٹھل تو کل رات یوں ہی بھائی کی خاطر وہاں ٹھہر گیا تھا۔ مجھے تو لگتا ہے یہ وڈیرے کے آدمیوں کی کارروائی ہے۔ اب تم سب لوگوں کی جان خطرے میں ہے۔"

ناصر کا چہرہ زرد ہوگیا، "یہ تو بڑا بُرا ہوا بادشاہ خان۔ اب میں نوری کو کیسے بتاؤں؟"

بادشاہ خان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کے اسے تسلی دی اور کہا، "میرا خیال ہے ابھی نوری کو کچھ مت بتاؤ، پولیس کے معاملات سے نمٹنے کے بعد سائیں راول کی میّت بھی کراچی پہنچائی جائے گی، اس وقت تک خاموش رہو، پھر مناسب موقع دیکھ کے—"

بادشاہ خان کا خیال تھا کہ تین ہٹی پر ناصر کا گھر گنجان آباد علاقے میں ہونے کی وجہ سے نسبتاً محفوظ جگہ پر تھا— اور واقعی یہ بات سچ نکلی کیوں کہ ناصر اور نوری وہاں سال بھر رہے اور کوئی ایسا ویسا واقعہ پیش نہیں آیا۔ ناصر کے گھر والے بھی دونوں کے وہاں آجانے سے بہت خوش تھے۔ بھائی عارف، بھابی، ان کا بیٹا عرفان اور اماں۔ عرفان کو نوری کی شکل میں لوڈو اور کیرم کے کھیلوں کے لیے ایک مستقل پارٹنر ہاتھ آگیا تھا۔

سائیں راول کے قتل نے نوری کو کئی مہینوں تک بہت غم زدہ رکھا مگر پھر آہستہ آہستہ اس کی طبیعت بحال ہوتی چلی گئی۔ بادشاہ خان مطمئن تھا مگر پھر بھی مطمئن نہیں تھا۔ وہ کہتا تھا، بہت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ اسے نور محمد ڈرائیور اور اس کے چاچا علی محمد کے

ذریعے پتا چلا تھا کہ وڈیرے کے آدمی ابھی تک ناصر اور نوری کی تلاش میں تھے اور گوٹھ میں نوری کو کاری قرار دے دیا گیا تھا۔ لہٰذا پورے قبیلے والوں کے لیے لازم ہوگیا تھا کہ نوری اور اس کے شوہر کو وہ سزا دیں جن سے ان کی قومی غیرت کی تسکین ہو سکے۔ یہ بات اگرچہ بادشاہ خان نے ناصر کو نہیں بتائی تھی مگر پروفیسر عظمت علی اور ناصر کے دوست عمران کو حالات کی سنگینی کا اندازہ تھا۔

عمران چھٹی کے روز نوری اور ناصر کو اپنے گھر لے جاتا۔ نوری کی ویرا بھابی سے بھی بڑی دوستی ہوگئی تھی، اتنی دوستی کہ جب نوری کے یہاں ولادت ہوئی تو ویرا نے اسے پورے ایک مہینے تک اپنے پاس ہی رکھا۔ نوری نے ایک بہت ہی پیاری سی بچی کو جنم دیا تھا جس کا نام ماروی رکھا گیا تھا۔ ناصر نے صفحہ الٹ دیا اور نیا باب پڑھنا شروع کیا۔

بقرعید کا دن تھا اور عارف قربانی کے بعد قصائی سے بکروں کا گوشت بنوا رہا تھا۔ ان کے یہاں دو بکروں کی قربانی ہوئی تھی اور عارف کا فیصلہ تھا کہ دونوں بکروں کی کھالیں عطیے میں ایدھی ٹرسٹ کو دی جائیں گی۔ مگر فوراً ہی دو موٹر سائیکل سوار ایک سوزوکی پک اَپ لے کر وہاں آدھمکے۔ وہ محلے بھر سے قربانی کی کھالیں جمع کرنے کی مہم پر نکلے ہوئے تھے۔

''آپ اپنی کھالیں ہمیں دیں گے نا؟'' انھوں نے عارف سے پوچھا۔

''نہیں تو—'' عارف نے جواب دیا، ''ہم کھالیں یا تو کسی یتیم خانے کو دیتے ہیں یا پھر ایدھی ٹرسٹ کو۔''

''نہیں سر، آپ یہ نہیں کرسکتے، چونکہ آپ کے گھر کے سب ووٹ ہمارے ہیں، اس لیے کھالیں بھی۔'' ایک نوجوان بولا۔

''مگر کھالوں کا ووٹوں سے کیا تعلق—'' عارف نے چڑ کے کہا، ''اور کیا پتا اس بار ہم ووٹ کس کو دیں، اس کا فیصلہ تو الیکشن کے وقت ہوگا!''

''آپ یک طرفہ کوئی فیصلہ نہیں کرسکتے۔'' موٹر سائیکل کا انجن گرجا، ''یہ پوری گلی ہماری ہے، اس کے ووٹ بھی اور قربانی کی کھالیں بھی!'' نوجوان نے کھالیں اٹھا کے سوزوکی میں ڈالنے کی کوشش کی مگر عارف نے کھال اس کے ہاتھ سے چھین لی، ''تم میری اجازت



کے بغیر اسے ہاتھ نہیں لگا سکتے۔'' اس نے کہا۔ مگر لڑکا بھی ڈھیٹ تھا بولا، ''خود بکرا بن جاؤ گے اگر کھال نہیں دو گے، یاد رکھو۔''

اب قصائی چھرا سنبھال کے اپنی جگہ سے اٹھا، ''ابے آ میں دیتا ہوں تجھے کھال— بھرم مارتا ہے سالا—'' نوجوان پسپا ہوگئے مگر ان کی موٹر سائیکل دیر تک گلی میں غراتی اور دھول اُڑاتی رہی۔

اس واقعے کے ہفتے بھر بعد عارف کو دوپہر میں اسکول سے واپس آتے ہوئے سڑک پر کچھ لڑکوں نے گھیر لیا۔ اسے زدوکوب کیا اور پھر اس کے اسکوٹر کو آگ لگا دی۔ عارف ان میں سے ایک لڑکے کو پہچان گیا۔ وہ وہی نامراد تھا جو بقرعید کے دن محلے والوں سے کھالیں بٹورتا پھر رہا تھا۔ اس کا نام گُلّو خوامخواہ تھا۔ عارف نے تھانے میں اس کے خلاف رپٹ لکھوا دی۔ پولیس اسے پکڑ کے لے گئی اور تین دن حوالات میں بند رکھا مگر اس واقعے کے فوراً بعد ہی وہ دوبارہ اسی شان سے گلی میں گھومتا نظر آیا مگر اس طرح کہ اس کے تیور بدلے تھے نہ ارادے۔ پھر شام کے وقت عارف کے گھر والوں کو کوئی شخص ایک سادہ لفافہ دے گیا۔ عارف نے لفافہ کھولا تو اندر سے ایک رقعہ نکلا جس پر صرف چند سطریں تحریر تھیں:

۱۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کا بیٹا کس اسکول میں پڑھتا ہے اور بیوی کس اسکول میں پڑھاتی ہیں۔

۲۔ ہم جانتے ہیں آپ کس مسجد میں نماز کے لیے جاتے ہیں۔

۳۔ ہمیں یہ بھی علم ہے کہ آپ کے گھر میں کتنے لوگ رہتے ہیں اور کتنے لوگ باہر سے ملنے آتے ہیں۔

۴۔ ہمیں داد دیجیے کہ ہم اپنے محلے والوں کی کتنی خبر رکھتے ہیں۔

۵۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہم خاموشی سے آپ کی ایسی ہی خبرگیری کرتے رہیں تو اپنا دستِ تعاون آگے بڑھایئے۔ قرض محبت کی قینچی ہے، لہٰذا ہم صرف نقد ادائیگی پر یقین رکھتے ہیں۔ بینک چیک یا جعلی کرنسی نوٹ ناقابلِ قبول ہوں گے! والسلام— آپ کا واقفِ حال

جب بادشاہ خان کو اس معاملے کا پتا چلا تو اس نے ناصر اور عارف کو فوری طور پر گھر

بدلنے کا مشورہ دیا۔ وہ بہت دنوں سے ان سے مکان بدلنے کی بات کر رہا تھا کیوں کہ اسے نوری کے گوٹھ سے اطلاع ملی تھی کہ وڈیرے کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا اور وہ اندر ہی اندر کسی خوف ناک کارروائی کی کھچڑی پکا رہا تھا مگر عارف کا خیال تھا کہ سب محلے والے جن میں ہر طرح کے لوگ شامل ہیں، اتنے عرصے سے اس کے گھر والوں کو جانتے اور پہچانتے ہیں اور ان سب سے ان لوگوں کے اتنے پرانے تعلقات ہیں کہ وہ انھیں اس محلے سے کہیں نہیں جانے دیں گے۔ اس خط کی دھمکی کو بھی اس نے بعض چھچھورے لڑکوں کی شرارت جانا۔ عارف نماز پڑھنے مسجد میں گیا تو وہاں بھی سب لوگوں نے اسے یہی مشورہ دیا کہ وہ مکان چھوڑنے کا خیال دل سے نکال دے کیوں کہ سارے محلے والے اس کے ساتھ ہیں۔

اس کے بعد پروفیسر عظمت علی نے ناول کا بیانیہ روک کے اخبار کا ایک تراشا نقل کیا تھا۔ یہ ایک خبر تھی:

**تین ہٹی کے ایک گھر پر نامعلوم مسلح افراد کا حملہ — گھر کو آگ لگا دی گئی، ایک ہی خاندان کے پانچ افراد ہلاک — ہلاک ہونے والوں میں تین خواتین اور ایک دس سالہ لڑکا شامل ہیں۔**

کراچی: ایک اندوہ ناک واقعے میں کل رات تین ہٹی کے علاقے میں ایک گھر پر نامعلوم مسلح افراد نے حملہ کر کے ایک ہی خاندان کے پانچ افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہلاک ہونے والوں میں خاندان کا سربراہ عارف، اس کی بوڑھی والدہ، اس کی بیوی، اس کا دس سالہ بیٹا اور اس کے بھائی ناصر کی بیوی نوری شامل ہیں۔

تفصیلات کے مطابق حملے سے کچھ دیر پہلے عارف کے گھر میں اس کے بھائی ناصر کی بیٹی کی سالگرہ منائی گئی تھی۔ عارف اس وقت گھر میں موجود تھا مگر ناصر اپنے دو دوستوں کو ان کی گاڑی تک چھوڑنے گیا تھا جو گلی سے باہر سڑک پر کھڑی تھی۔ پولیس کا کہنا ہے کہ فائرنگ شروع ہوتے ہی ناصر کے ایک دوست کی بیوی ویرا، ناصر کی ایک



سالہ بیٹی کو گود میں اٹھا کے پچھلے دروازے سے باہر نکلیں اور اپنی موٹر سائیکل پر بیٹھ کے تیزی سے متاثرہ علاقے سے دور ہو گئیں، اس طرح دونوں کی جانیں محفوظ رہیں۔ یاد رہے کہ ویرا مشہور خاتون کرتب باز ہیں اور ایک مقامی سرکس کے اندر موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلاتی ہیں۔

خبر کا تراشا نقل کرنے کے بعد پروفیسر عظمت علی نے ناول کے بیانیے کو آگے بڑھایا۔

ناصر کے لیے یہ کیسا دل خراش اور اندوہ ناک لمحہ رہا ہوگا جب اس کے گھر کے سارے افراد بعض نامعلوم دشمنوں کی نفرت کا شکار ہوئے — ماں، بھائی، بھابی، چہیتا بھتیجا اور پھر نوری — اس کی محبت — اس کے لیے بہت دنوں تک یہ فیصلہ کرنا مشکل رہا کہ وہ خود بھی زندہ ہے یا مر گیا ہے — جانے والے اپنے ساتھ اس کی جیتے رہنے کی خواہش بھی لے گئے تھے۔ مگر مرنا مشکل تھا اور جیتے رہنا اس سے زیادہ مشکل — اس مشکل کو آسان بنانے میں جو لوگ ناصر کے کام آئے ان میں عمران، اس کی بیوی ویرا اور بادشاہ خان سرِفہرست ہیں۔ ویرا نے مگر کمال کر دکھایا۔ اس نے اپنی غیر معمولی حاضر دماغی اور بہادری سے سب لوگوں کے دل موہ لیے۔ تین ہٹی کی اس لہولہان رات کے بارے میں ویرا کے بیانات کو اخبارات اور ٹی وی چینلوں نے خوب نمایاں طریقے سے چھاپا اور نشر کیا۔ اس سلسلے میں ویرا نے جو انٹرویو 'سچ' ٹی وی چینل کو دیا، اسے پولیس نے کیس کے متعلق اپنی رپورٹ میں شامل کر لیا ہے۔

ناصر نے اگلا صفحہ پلٹا۔



# ٢٧

# ویرا نے کہا

*(''سچ'' ٹی وی چینل کے ٹاک شو 'میری سنو' میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی مشہور خاتون کرتب باز ویرا کا انٹرویو)*

میزبان: خاتون کل شہر میں ایک گھر پر حملے کے دوران پانچ افراد کی ہلاکت کا جو اندوہ ناک واقعہ پیش آیا، اس موقعے پر آپ بھی وہاں موجود تھیں۔ ایک عینی شاہد کی حیثیت سے کیا آپ اس واقعے کی تفصیلات ہمارے ناظرین کو بتائیں گی؟

ویرا: کیوں نہیں، میں نہ صرف وہاں موجود تھی بلکہ آگ وخون کے اس ہول ناک قصے کا ایک کردار بھی بن گئی تھی۔ اس حملے میں جاں بحق ہونے والے میرے رشتے دار تو نہیں تھے مگر رشتے داروں سے بڑھ کے تھے۔ میرے شوہر کے دوست ناصر کی بیوی نوری اپنی ایک سالہ بچی کے ساتھ اس گھر میں مقیم تھی جس میں ناصر کی والدہ، بھائی اور بھابی اور ان کا دس سالہ بیٹا عرصے سے رہ رہے تھے۔ افسوس اس سانحے میں ناصر کو اپنی بیوی سمیت سارے عزیز ترین افراد کی جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا، اس کے باوجود اگر وہ اپنے ہوش وحواس میں ہے تو یقیناً وہ نہایت عظیم انسان ہے۔''





میزبان: ویسے ایک عظیم کام تو آپ نے بھی کیا ہے جو گولیوں کی بوچھاڑ میں ناصر کی ایک سالہ بچی کو بچا لانے میں کامیاب ہوئیں۔ آخر یہ سب کیسے ہوا؟

ویرا: اس رات ہم لوگ وہاں ناصر کی بچی کی پہلی سال گرہ کی تقریب میں مدعو تھے۔ تقریب ختم ہوئی تو کھانے کے بعد ناصر میرے شوہر عمران کے ساتھ اپنے دوست بادشاہ خان کو ان کی گاڑی تک رخصت کرنے چلا گیا جو گلی کے باہر سڑک پر کھڑی تھی، اس لیے وہ تینوں محفوظ رہے۔ باقی تمام لوگ گھر کے اندر موجود تھے۔ میں اس وقت بچی کو اپنی گود میں لیے بیٹھی تھی کہ اچانک فائرنگ شروع ہوگئی۔ میں نے فوراً بچی کو بغل میں دبایا اور پچھلے برآمدے کی طرف لپکی جہاں پچھلے دروازے کے سامنے میری موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ میں نے بچی کو کیریئر پر لگی ٹوکری میں ڈالا اور موٹر سائیکل اسٹارٹ کی جو پہلی ہی کک پر غرا کے جیسے ہوا میں اُڑ گئی۔ پھر مجھے پتا نہیں کیا ہوا، مجھے تو اس وقت ہوش آیا جب موٹر سائیکل گلی کا موڑ کاٹ کے کھلی سڑک پر آچکی تھی اور ہم گولیوں کی زد سے باہر جا چکے تھے۔

میزبان: آپ کا نام موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے والی خاتون کرتب باز کی حیثیت سے بہت مشہور ہے، یقیناً اس رات بھی آپ نے ثابت کردیا کہ آپ کی موٹر سائیکل موت کے کنویں میں زندگی کے راستے کو پہچانتی ہے۔ ویسے آپ کے خیال میں جن لوگوں نے اس رات اتنے سارے لوگوں کو موت کے کنویں میں اتارنے کی کوشش کی، وہ کون ہوسکتے ہیں، پولیس کا کہنا ہے کہ حملہ آوروں میں بہت سے افراد شامل تھے۔

ویرا: یہ کہنا واقعی بہت مشکل ہے کہ وہ کون لوگ تھے۔ آج کل ویسے بھی آدمی کا کوئی ایک دشمن نہیں ہوتا۔ ناصر کی بیوی کو اس کے گوٹھ میں کاری قرار دے دیا گیا تھا، عارف نے کسی کو کھال نہ دے کر ناراض کردیا تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی کو اس کا کسی خاص مسجد میں نماز پڑھنے جانا پسند نہ ہو، پھر بادشاہ خان، ناصر کا دوست تھا، ناصر جو مہاجر تھا اور بادشاہ خان خالص پٹھان—— یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے ان سے کسی کے ناراض ہونے کی۔ پولیس شاید ٹھیک کہتی ہے کہ حملہ آور کوئی بھی ہوسکتے ہیں۔ ان کا تعلق کسی ایک گروہ یا شاید کئی گروہوں سے ہوسکتا ہے۔ ویسے بھی آج کل کسی کو قتل کرنے کے لیے کسی بہت بڑی وجہ کی

ضرورت نہیں ہوتی۔

میزبان: اگر یہ مان لیا جائے کہ کچھ لوگ ناصر اور اس کی بیوی کو جان سے مار دینا چاہتے تھے تو انھیں اپنے مشن میں نصف کامیابی حاصل ہوئی ہے، آپ کے خیال میں کیا ناصر کی جان کو خطرہ موجود ہے؟

ویرا: میں نے جب وہاں سے بھاگتے ہوئے پلٹ کے ناصر کے گھر کی طرف دیکھا تو وہاں شعلے اٹھتے نظر آئے۔ یہ شعلے اس کے گھر کے بھی تھے اور اس کے جگر کے بھی— مگر یہ شعلے ناصر کو بھسم کرنے میں ناکام رہے، لہٰذا ابھی یہ پورا امکان موجود ہے کہ ایک مرتبہ پھر یہ کوشش دُہرائی جائے۔

میزبان: اس صورتِ حال میں آپ ناصر کو کیا مشورہ دیں گی؟

ویرا: یہی کہ وہ موت کے سفیروں کو ناکام بنانے کی ہر ممکن کوشش کرے، زندہ رہ کر ہی انھیں بھرپور شکست دی جا سکتی ہے۔

پورا انٹرویو نقل کرنے کے بعد پروفیسر عظمت علی نے ناول آگے بڑھایا۔

تین ہٹی کے سانحے کے بعد ناصر پر مایوسی کے دورے پڑنے لگے تھے اور عمران اور بادشاہ خان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس کی ذہنی حالت کو بہتر بنائیں۔ آخر انھوں نے ناصر کے لیے ایک 'جان بچاؤ' منصوبہ بنایا جس میں اسے راتوں رات یہاں سے دُبئی روانہ کرنے کے انتظامات شامل تھے۔ اس معاملے میں بادشاہ خان اور عمران کے سارے ملکی اور غیر ملکی رابطے کام آئے۔ پھر ایک رات—

اور آگے کا سارا حال بغیر پڑھے ناصر کی نظروں کے سامنے گھوم گیا۔ ناصر نے کتاب بند کرتے ہوئے سوچا، ابھی تو یہ کتاب نامکمل ہے، اس میں ان اندھیری راتوں کا تو ذکر ہی نہیں جنھوں نے اس کی روح کے اندر بھوت خانہ کھول رکھا تھا۔ ہر گزرا لمحہ اس کے لیے بھوت بن گیا تھا۔

O

# ۲۸

# سند باد جہازی کا آخری سفر

جمعے کی شام تھی اور ابوعبید کا ڈیرہ— اور سند باد جہازی مزے لے لے کر اپنے آخری سفر کی داستان سنا رہا تھا۔

دو روز پہلے ابوعبید نے ناصر کو پیغام بھیجا تھا کہ وہ بلا کسی تاخیر کے اس سے آکر ملے۔

ناصر نے نائر سے پوچھا، "کیا معاملہ ہے، کوئی ایمرجنسی ہے کیا؟"

"دو اہم خبریں ہیں—" ناصر نے جواب دیا، "سلطان البحر' کو صومالی قزاقوں سے چھڑا لیا گیا ہے اور وہ کل دُبئی پہنچ رہا ہے— سارے عملے کے ساتھ— اس موقعے پر ابوعبید نے شکرانے کی دعوت رکھی ہے۔"

"اور دوسری خبر؟" ناصر نے پوچھا۔

"وہ بہت افسوس ناک ہے۔" نائر نے کہا، "سند باد مر رہا ہے۔"

"کیا—؟" ناصر کو اپنے کانوں پر یقین نہیں آیا۔

"ہاں وہ مر رہا ہے— وہ دُبئی اسپتال میں داخل ہے اور اپنی خطرناک بیماری کے آخری مرحلے میں—"

"کیسی بیماری؟" ناصر نے کہا، "وہ تو بڑا ہٹا کٹا اور صحت مند تھا، جب آٹھ دس مہینے

پہلے یہاں سے گیا تھا۔"

"مگر اب تم اسے بالکل بدلا ہوا پاؤ گے — خیر، اب وہ سب سے ملنا چاہتا ہے، اس لیے ابوعبید نے اسپتال کی انتظامیہ سے خصوصی اجازت لی ہے کہ سند باد کو ایک شام کے لیے ابوعبیدہ کے ڈیرے پر آنے دیں جہاں وہ اپنے پچھلے سفر کی داستان سنائے گا۔ ایک ڈاکٹر اور دو نرسیں اس کے ساتھ ہوں گی۔" نائر نے کہا۔

ناصر ابوعبید کے پاس پہنچا تو اس نے اس سے بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا اور خوش ہو کے بولا، "شکر ہے اللہ کا، 'سلطان البحر' لوٹ رہا ہے، اپنے سارے عملے سمیت، کسی کا بال بیکا نہیں ہوا۔"

"قزاقوں نے آخر اسے چھوڑا کیسے؟" ناصر نے پوچھا۔

"تاوان کی رقم وصول کر کے اور کیسے — بس ہیلی کوپٹر کے ذریعے جہاز تک پہنچنا پڑا جس پر مسلح قزاقوں نے مورچے لگا رکھے تھے۔ جب اوپر سے تاوان کی رقم ایک تھیلے میں عرشے پر لٹکائی گئی تو انھوں نے کچھ دیر بعد جہاز خالی کر دیا اور اپنی موٹر بوٹوں میں سوار ہو کے چلے گئے۔"

ابوعبید نے بتایا، "جہاز کے عملے کے سب ہی لوگ اتنے دنوں کی جسمانی اور ذہنی اذیت کی وجہ سے بیمار پڑ گئے تھے۔ انھیں حراست کے دوران صحیح خوراک بھی نہیں ملی تھی، لہٰذا بڑی قابلِ رحم حالت تھی سب کی، مگر خیر، اللہ تعالیٰ نے بڑا کرم کیا، ان کی زندگیاں محفوظ رہیں۔"

"اور جہاز کا سامان؟" ناصر نے پوچھا۔

"سامان تو وہ سارا لوٹ کے لے گئے — اپنی بندرگاہ تک جہاز کو لے جانے کا مقصد یہی تھا۔" ابوعبید نے جواب دیا۔

"پھر بھی انھوں نے تاوان کی رقم وصول کر لی؟" ناصر حیران ہوا۔

"بھئی وہ رقم تو ارکانِ عملہ کی جاں بخشی کے لیے تھی نا —" ابوعبید نے کہا، "بہر حال میں بہت خوش ہوں۔"

"اور یہ سند باد جہازی کا معاملہ؟" ناصر نے سوال کیا۔



"وہ بے چارہ تو بہت بیمار ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں کہ اس کا مرض بہت بڑھ چکا ہے — مگر وہ مصر ہے کہ اپنے دوستوں کو اپنے تازہ سفر کی رُوداد سنا کے رہے گا — اسی لیے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی آؤ اور اس کے دیگر دوستوں کو بھی خبر کر دو — سب آئیں گے تو اس مرتے ہوئے آدمی کو خوشی ہوگی۔" ابوعبید بولا۔

تو وہ جمعے کی شام تھی اور ابوعبید کے ڈیرے پر قصہ خوانی بازار گرم تھا۔ سند باد جہازی اپنے اسپتال کے فراہم کردہ خصوصی بیڈ پر لیٹا ہوا تھا۔ ایک نرس اس کے قریب بیٹھی ان آلاتِ طبابت کی نگرانی کر رہی تھی جو اس کے فشارِ خون اور حرکتِ قلب کی پیمائش پر مامور تھے۔

سند باد کے سب دوست اس کے قریب قالین پر بیٹھے تھے۔ قہوے کے فنجان، کھجوریں، فلافل اور بغلاوے کے طشت سامنے میز پر دھرے تھے اور خوب صورت پیچ دار، نرم نلکیوں اور رنگ برنگی بلّوریں صراحیوں والے شیشے بھی موجود تھے تاکہ مہمانوں کی خاطر بھی جاری رہے۔

آخر سند باد جہازی نے اپنے سفید تکیوں سے ٹیک لگا کے دھیمی آواز میں اپنے قصے کا آغاز کیا۔

"تو دوستو — سنو، یہ سفر میری زندگی کا سب سے عجیب و غریب اور حیرت ناک سفر تھا۔ ویسے تو جب میں ماضی میں جھانکتا ہوں تو ہر سفر کے دوران ایسے ایسے واقعات پیش آئے کہ آدمی کے ہوش اُڑ جائیں۔ بپھرے سمندروں کے سرے پر واقع تاریک ساحلوں سے قانون کی آنکھ بچا کے نئی سرزمینوں اور نئے آسمانوں کی تلاش میں نکلنے والے سر پھرے لوگوں کو اُن کی منزلوں تک پہنچانا کوئی آسان کام تو نہیں تھا۔ اسی طرح خلیجی، افریقی اور ہندوستانی بندرگاہوں سے سونے، چاندی اور ہاتھی کے دانتوں کے ذخیروں کو دور دراز منڈیوں تک لے جانے کے کام میں جو خطرات لاحق ہوتے تھے، ان کا تصور بڑے بڑوں کی ہمت پست کر دینے کے لیے کافی تھا لیکن میں نے یہ سب کچھ کیا یہاں تک کہ سندر بن کے بنگال ٹائیگروں اور سخت پہرے کے باوجود کویت اور عراق کے تیل کے کنوؤں سے چوری کیے جانے والے تیل کے پیپوں کی اسمگلنگ بھی ناچیز کے کارناموں میں شامل ہے — مگر —"

وہ سانس لینے کو رُکا اور میز پر رکھے گلاس سے پانی کا ایک گھونٹ پینے کے بعد بولا، ''اس سفر کی بات ہی کچھ اور تھی۔ روانگی کے وقت موسم بالکل ٹھیک تھا اور ہوا موافق تھی لیکن جب ہم آبنائے ہرمز کی بندرگاہوں کو پار کر کے بحیرۂ عرب کے پانیوں میں پہنچے تو موسم بدلنے کے آثار نمودار ہونا شروع ہوئے اور اس بار توقع سے پہلے مون سون کے بادلوں نے ہمارے سروں پر سیاہ سائبان تان دیے اور تیز ہواؤں کے جھکڑ چلنے لگے۔ بہرحال، تیز بارشوں کی آمد سے پہلے ہی ہم ہندوستان کے مغربی ساحل پر پہنچ گئے۔

طوفانی بارشوں کے دوران میں نے اپنے جہاز کو ایک چھوٹی سی بندرگاہ پر لنگرانداز رہنے دیا۔ پھر ناریل، تاڑ اور چھالیا کے درختوں سے گھرے ہوئے اس سرسبز و شاداب جزیرے پر بڑے پُرلطف دن رات گزر رہے تھے کہ ایک رات جب بارش تھمی ہوئی تھی اور آسمان کو گھرے بادلوں نے ڈھانپ رکھا تھا، میں نے ایک خوب صورت دوشیزہ کو سمندر کے جھاگ سے نکل کے ساحل کی طرف آتے دیکھا۔ میں اس سے قبل بھی نجانے کتنی جل پریوں کی قربت کا لطف اٹھا چکا تھا اور بپھرے سمندروں میں ہاتھیوں سے زیادہ قوی ہیکل وہیلوں کی سواری کر چکا تھا، لہٰذا ان آبی مخلوقات سے مجھے ایک طرح سے دلی اُنسیت تھی۔

وہ سمندری دوشیزہ بھی مجھے اجنبی نہیں لگی، لہٰذا میں کسی ڈر یا خوف کے بغیر اس کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ حسینۂ دل نواز میرے پاس آ کے بیٹھ گئی اور ہم دیر تک گیلی ریت پر ساتھ ساتھ بیٹھے سمندر کی لہریں گنتے رہے۔ پھر اس نے میرا ہاتھ پکڑ کے مجھے اٹھایا اور سمندر کی طرف لے کے چلی۔ پانی خود بخود ہمارے لیے راستہ بناتا گیا اور ہم گہرائی میں اترتے چلے گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہم ایک ایسی زیرِ آب بستی میں جا پہنچے جہاں گھر جھلملاتی سیپیوں سے بنے تھے اور ان کے چاروں طرف ایسے پیڑ تھے جن کے تنے سمندری کائی سے اور ٹہنیاں اور پتے لولو اور مرجان سے تراشے گئے تھے۔ وہ حسینۂ آبی مجھے ایک محل کے اندر لے گئی جہاں ہر چیز حیران کر دینے والی تھی۔ آپ ہی آپ کھلنے والے دروازے اور پانی سے بنے ہوئے بستر جن پر بغیر ڈوبے لیٹا جا سکتا تھا۔ محل کی دیواریں بھی پانی سے بنی تھیں، شفاف نیلے پانی سے اور اس میں مچھلیاں تیرتے ہوئے ستاروں کی طرح چمکتی تھیں جس کی وجہ سے ہر طرف صبح کا اُجالا پھیلا ہوا تھا۔ میں بہت دیر تک وہاں رہا۔ پھر اس آبی پری زا



نے تالی بجائی اور دوسرے ہی لمحے میں نے اپنے آپ کو اپنے جہاز میں پایا جو ساحل پر لنگرانداز تھا۔ بہت دنوں تک یہی ہوتا رہا اور وہ آبی حسینہ ہر روز مجھے اپنے آبی محل کی سیر کے لیے لے جاتی رہی مگر پھر بارشیں تھم گئیں، بادل چھٹ گئے اور چاند نکل آیا اور اس کے بعد میں نے اسے واپس آتے نہ دیکھا۔ مجھے پتا چلا کہ وہ صرف اندھیری راتوں میں سمندر کے باہر نکلتی تھی۔''

سندباد نے ٹھہر کے پانی کا گلاس اٹھایا اور اسے منہ سے لگا کے خالی کر دیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ پھر بولا، ''اب جہاز پر سے سارا سامان اتارا اور بہت سا لادا جا چکا تھا اور ہمیں اگلی منزل کے لیے روانہ ہونا تھا۔ سفر دوبارہ شروع ہوا اور ہم لوگ ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ایک ریاست کی بندرگاہ پر پہنچے۔ ریاست کی روایت کے مطابق ہر جہاز کے کپتان کو ریاست کے سلطان کی خدمت میں حاضر ہو کے تحائف پیش کرنا پڑتے تھے۔ میں نے بھی دستور کے مطابق انھیں بہت سارے تحائف نذر کیے جن میں موتیوں کے ہار، ہاتھی دانت کے بنے ہوئے زیورات اور دور دراز جزیروں سے حاصل ہونے والے انوکھے معجون، مرہم اور شربت شامل تھے جن کے استعمال سے بوڑھے جوان ہو جاتے تھے۔ سلطانِ محترم و معظم کو میرے تحفے اس قدر پسند آئے کہ انھوں نے مجھے خصوصی اعزاز بخشتے ہوئے اپنے عملے کے خاص خاص لوگوں کے ساتھ رات میں اپنے محل میں آنے کی دعوت دی۔ اپنے تئیں میں بہت بن ٹھن کے وہاں گیا تھا مگر پتا چلا کہ شاہی ضیافت میں شرکت کے لیے ہمیں ایک خصوصی لباس پہننا پڑے گا جو کمرۂ مدارات میں پہلے سے موجود تھا۔ میں نے دیکھا کہ پورا لباس درختوں کی کھردری چھال سے تیار کیا گیا تھا اور جسے پہن کے مجھے یوں لگا جیسے مجھے لکڑی کے کسی صندوق میں بند کر دیا گیا ہے۔ بدن کا ہر حصہ لکڑی کی طرح سخت اور بے جان ہو گیا تھا۔ کھانے کے کمرے میں اعلیٰ حضرت نے ہمارا گرم جوشی سے استقبال کیا اور سب سے پہلے اس بات پر معذرت کی کہ ہمیں چوبی لباس پہنایا گیا حالاں کہ سلطانِ معظم خود صرف وہی بہشتی ملبوس زیبِ تن کیے ہوئے تھے جو کبھی حضرتِ آدم کو میسر آیا تھا۔ ہمیں حیران پا کے آپ نے فرمایا کہ اس اچھوتی ضیافت کے ذریعے لوگوں کو اپنے نفس پر قابو رکھنے کی تربیت دی جاتی

ہے تاکہ وہ پاک و پاکیزہ رہ سکیں۔ تزکیۂ نفس کی اس مشق کے بعد آدمی اس قابل ہو جاتا ہے کہ وہ اس جنتِ گم گشتہ کو دوبارہ لوٹ سکے جہاں اس سے پہلا گناہ سرزد ہوا تھا۔ خود سلطان کو دیکھ کے پتا چلتا تھا کہ وہ اپنی اس بہشت کی تعمیر مکمل کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں جہاں ستر پوشی کے لیے صرف انجیر کے پتے کام آتے ہیں۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوا جب ہم لوگوں کو کھانے کے دسترخوان پر لے جایا گیا۔ وہاں قالین کے بیچوں بیچ ایک ایسا دسترخوان بچھا ہوا تھا جس پر پہلی نظر میں مجھے ایک عریاں دوشیزہ کا گمان ہوا۔ میں نے آنکھیں مل کے دوبارہ دیکھا تو یقین آ گیا کہ میری بینائی بالکل ٹھیک کام کر رہی ہے۔ واقعی وہاں ایک عورت قالین پر خوانِ بہشت کی طرح سجی ہوئی تھی اور اس کے بدن کے مختلف حصوں کو لذیذ کھانوں سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ تلی ہوئی مچھلیاں، ہرن کے کباب، مصالحے دار پلاؤ، خوش بودار تندوری کلیجے — اور بعض جگہیں جو خالی رہ گئی تھیں، ان پر سلاد کے سبز پتوں اور ٹماٹر کے سرخ قتلوں سے گل بوٹے بنائے گئے تھے۔ مجھ سے تو کچھ زیادہ کھانا نہ کھایا گیا مگر سلطانِ معظم اور ان کے درباریوں نے کھانے کے ساتھ پورا انصاف کیا اور بعد میں خوب گونجیلی ڈکاریں لیں۔ کھانے کے بعد جب پھلوں اور میٹھے پکوانوں کا دور چل رہا تھا، سلطانِ معظم نے میری طرف پلٹ کے دیکھا اور فرمایا، ”امید ہے تم نے خوب اچھی طرح کھایا ہوگا، یہ ’خوانِ نعمت‘ دنیا میں تمھیں کہیں اور نہیں مل سکتا۔“ پھر وہ مسکرائے اور گویا ہوئے، ”ہم چاہیں تو یہ پورا دسترخوان تمھیں بخش سکتے ہیں۔“ انھوں نے قالین پر دراز عورت کی طرف اشارہ کیا جو اب اپنی آنکھیں کھول کے بڑی لگاوٹ سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

”مگر نہیں —“ سلطانِ معظم پھر بولے، ”اس سے تمھاری تزکیۂ نفس کی سعی میں کھنڈت پڑے گی۔“

”بجا ارشاد کیا —“ کئی درباری بولے، ”یہ صرف حضور ہی کو زیب دیتا ہے کہ اس آسمانی عطا کو شرفِ قبولیت بخشیں۔“

کہانی کے اس موڑ پر پہنچ کے ابوعبید نے گرم قہوے کا ایک گھونٹ نگلا اور بولا، ”یار تمھارا یہ سلطان تو بڑا ہی چالاک نکلا، اپنی جنت زمین پر ہی بنا رکھی ہے۔“ کچھ لوگ ہنسے —



سند باد جہازی نے کہا، ”سارے سلطان اور سارے راجا ایسے ہی ہوتے ہیں۔ مجھے پتا تھا لہٰذا میں نے انھیں ناراض نہیں کیا اور خوش خوش واپس آ گیا۔“

”خیر تم ناراض ہی کس کو کرتے ہو۔“ ابوعبید نے کہا، ”تمھارا تو فلسفہ یہی ہے نا کہ خوش رہو اور خوش رکھو!“

”بے شک — اے مردِ دانش مند!“ سند باد نے ہاتھ اٹھایا، ”تو مجھے خوب سمجھتا ہے مگر ایسا بھی نہیں ہے کہ میں نے کسی کو ناراض نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں نے اپنی حرکتوں سے سمندر کی اس جنّی کو ضرور ناراض کر دیا ہے جو طیش میں آ کے بے وفا ملّاحوں کو پیڑ کے تنے کی طرح چیر ڈالتی ہے۔ بے شک وہ مجھ پر بہت مہربان تھی اور ہر سفر میں میری حفاظت کرتی تھی مگر اس بار — مجھے یقین ہے کہ ایسا ہی ہوا ہے۔“

سند باد نے اپنے بازو میں پلاسٹک کی نلکی سے منتقل ہوتے ہوئے محلول کو غور سے دیکھا اور بولا، ”مجھے کیا پتا تھا کہ ایک دن مجھے پلاسٹک کے سانپ ڈسیں گے — سانپوں سے مجھے محبت ہے۔ پیڑوں والی سرزمین کیرالا میں ایک بار مجھے سانپ کشتی میں بیٹھنے کا بھی اتفاق ہوا اور مجھے اس سے عشق ہو گیا۔ ساری کشتیاں مجھے پسند ہیں مگر سانپ کشتی — اس کا مزہ ہی کچھ مت پوچھو۔ مگر اس بار جب میں راستے میں بیمار ہوا تو ایک رات جب میں بہت تکلیف میں تھا، میں نے ایک خواب دیکھا کہ میں ایک چمکیلے سانپ سے لپٹا ہوا سمندر میں تیر رہا ہوں، میں سانپ سے خود کو چھڑانا چاہتا ہوں مگر وہ سمندر کی لہروں کو چیرتا تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا ہے — سانپ کشتی کی طرح۔“

پھر وہ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر غم زدہ آواز میں بولا، ”میں مر رہا ہوں، اس نے مجھ سے انتقام لے لیا ہے۔“

باہر نکل کے ناصر نے ابوعبید سے پوچھا، ”مجھے نہیں پتا تھا کہ سمندر میں بھی کوئی جنّی رہتی ہے جو بے وفا ملّاحوں سے انتقام لیتی ہے، یہ کیسا انتقام ہے؟“

”اسے ایڈز کہتے ہیں۔“ ابوعبید نے جواب دیا۔



# ۲۹

# عبرے کے مسافر

سمندری سرنگ سے باہر نکلتے ہی ناصر کو الٹے ہاتھ پر ایک بس اسٹاپ کے پاس لتا ڈیسائی اپنی گاڑی کے پاس پریشانی کی حالت میں کھڑی نظر آئی۔ اس کی کار کی دونوں ہنگامی بتیاں روشن تھیں مگر اس کی اپنی آنکھیں دھندلائی ہوئی لگ رہی تھیں۔ ناصر نے ٹیکسی والے کو گاڑی روکنے کو کہا اور باہر نکلا۔

"کیا بات ہے؟" اس نے لتا سے پوچھا۔

"شکر ہے تم آ گئے۔" وہ بولی، "اچانک کار نے جواب دے دیا، انجن آگ بگولا ہو گیا ہے۔"

ناصر نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا، "پانی ہوگا تمھارے پاس؟"

"کیوں نہیں۔" اس نے اپنی ڈکی میں سے پانی سے بھرا کین باہر نکالا۔ ناصر نے لتا کی گاڑی کا بونٹ کھول کے ریڈی ایٹر کا ڈھکن کھولا تو گرم پانی اور بھاپ کا فوارہ اٹھا۔ ناصر نے لتا سے کہا کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کرے۔ انجن چلنا شروع ہوا تو ناصر نے اس کی پیاس بجھانا شروع کی — پورا کین خالی ہو گیا۔

"لگتا ہے تمھارا ریڈی ایٹر ٹپک رہا ہے، فوراً اس کی مرمت کراؤ۔" ناصر بولا۔





"لتا نے کہا، "ٹھیک ہے، میں فوراً اسے اپنے مکینک کے پاس لے جاؤں گی۔ بہرحال تمھاری غیبی مدد کا شکریہ۔" اس نے اپنے بالوں کو سنوارا اور بولی، "اگر تم کہیں جا نہیں رہے ہو تو میرے ساتھ ہی چلو — میں اس وقت الف لیلہ تھیٹر کی طرف جا رہی ہوں، مرجینا کا انٹرویو کرنے۔"

ناصر نے ٹیکسی والے کو کرایہ دے کر رخصت کر دیا اور خود لتا کے برابر میں بیٹھ گیا۔ لتا نے گاڑی آگے بڑھائی۔ انجن کا غصہ اب ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

"تم کہاں سے آ رہے تھے؟" لتا نے پوچھا۔

"آج صبح سویرے ہمارے ٹرک سعودی عرب کے لیے روانہ ہوئے ہیں، مال لے کر — جلدی فراغت ہو گئی تو سوچا ابوعبید کے چارٹرڈ اکاؤنٹینٹ ڈرائیور کم پرسنل اسسٹنٹ زیادہ، نائر سے ملتا چلوں — کل اس نے فون کیا تھا کہ ابوعبید نے 'سلطان البحر' کو فروخت کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔"

لتا نے پوچھا، "ارے وہی عربی کشتی نا جسے پچھلے مہینے صومالی قزاقوں نے اغوا کر لیا تھا؟"

"ہاں — وہی!" ناصر نے کہا، "ابوعبید کے لیے 'سلطان البحر' محاوراتی، سفید ہاتھی، ثابت ہو رہا ہے، نقصان ہی نقصان — جب سے اس نے یہ جہاز تیار کیا ہے، اس کی کمپنی کا تو دیوالیہ ہی نکل گیا ہے، پہلے کویتیوں نے اس کا کارخانہ خرید لیا پھر قزاقوں نے جہاز لوٹ لیا اور تاوان کی رقم اوپر سے۔"

"اوہو!" لتا بولی، "اسے چاہیے تھا کہ وہ یہ منحوس جہاز سندباد جہازی کو بیچ دیتا تا کہ وہ اسے کسی دور دراز سمندر میں لے جا کے کسی جناتی وہیل سے ٹکرا دیتا۔"

"آہ، بے چارہ سندباد —" ناصر نے افسوس سے کہا، "وہ تو مرنے والا ہے — اسے ایڈز نے جکڑ رکھا ہے۔"

"کیا —؟" لتا کو جھٹکا لگا، "قاتلوں اور مقتولوں سے بھری اس دنیا میں یہ لوگ وہ ہیں جنھیں کوئی دوسرا قتل نہیں کرتا، وہ خود اپنے آپ کو قتل کرتے ہیں، افسوس!"

مرجینا الف لیلہ تھیٹر کی کینٹین میں موجود نہیں تھی۔ بیرے سے پتا چلا کہ وہ اسٹیج پر ہے

اور کھیل ختم ہوتے ہی یہاں آئے گی۔ لتا اور ناصر ایک میز کے گرد کرسیاں گھسیٹ کے بیٹھ گئے۔ بیرے نے ان کی شیشے کی میز صاف کی اور پانی کے دو گلاس سامنے لا کے رکھے۔

"سامنے والی میز پر جو آدمی بیٹھا ہے، وہ بھی ان کا انتظار کر رہا ہے۔" بیرے نے انھیں بتایا، "وہ کافی دیر سے اُن کے انتظار میں ہے۔"

ناصر نے پلٹ کے دیکھا۔ عربی کنتورے میں ایک نہایت نستعلیق شخص پیچھے، والی میز پر بیٹھا، ننھی سی ہیروں والی تسبیح ہلا رہا تھا اور اس کی آستینوں کے دُہرے کفوں میں سونے کے بٹن جھلملا رہے تھے۔ ناصر کو یاد آیا، اس نے اس شخص کو پہلے بھی کئی بار مرجینا کے پاس آتے جاتے دیکھا تھا۔

ناصر نے لتا سے پوچھا، "تمھیں تو شہر کے سارے ہی مشتبہ لوگوں کا علم ہے۔ ہر ایرے غیرے نتھو خیرے کو پہچانتی ہو، بتاؤ تو بھلا یہ مردِ نابجار کون ہے جو مرجینا سے ملنے کے لیے یہاں دو گھنٹے سے چلہ کشی کر رہا ہے؟"

لتا نے اس آدمی کو دیکھا اور بولی، "یہ کوئی ایرا غیرا نہیں۔ شہر کے سب سے بڑے شاپنگ مال کے مالک کا ولی عہد ہے اور مرجینا کو اپنے والد کی اجازت کے بغیر اپنے شاپنگ مال ایمپائر کی ملکہ بنانا چاہتا ہے۔"

"ارے واہ—!" ناصر نے تعریفی نظروں سے لتا کو دیکھا، "تم تو سچ مچ میں اس شہر کی چلتی پھرتی انسائیکلو پیڈیا ہو بھئی!"

لتا نے کہا، "ارے بھئی، آخر ایک اخبار میں کام کرتی ہوں اور آنکھیں اور کان کھلے رکھتی ہوں— اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔"

ناصر کو اچانک کیلاش کا خیال آیا، "تم نے کیلاش کے بارے میں نہیں بتایا، موصوف آج کل کہاں ہیں، وہ آج کل نظر نہیں آ رہے؟"

"تمھارا مطلب ہے میرے ساتھ؟" لتا نے بھویں اوپر اٹھائیں، "کیلاش میرا دوست ہے بس— مگر وہ یہ بات نہیں سمجھتا۔ تم مرد لوگ نہایت جلد باز اور جذباتی ہوتے ہو— میں یہ بات جانتی ہوں!"



"مگر اس کے دل میں تمھاری جو حیثیت ہے، وہ میں جانتا ہوں۔" ناصر بولا۔

"لیکن میں اسے سمجھا چکی ہوں کہ میں ایک شادی شدہ عورت ہوں اور میرا شوہر اپنے دفتر کی طرف سے پیشہ ورانہ تربیت کے لیے سال بھر سے ملک سے باہر گیا ہوا ہے— اور وہ ایک دن لوٹ آئے گا۔" لتا نے جیب سے سگریٹ نکال کے سلگائی، پھر سرد لہجے میں بولی، "اور میں چوری سے نفرت کرتی ہوں۔"

اسی وقت مرجینا نازل ہوئی۔ وہ تیر کی طرح ناصر اور لتا کی میز کی طرف آئی۔

"سلام علیکم! میں نے زیادہ انتظار تو نہیں کرایا نا—" وہ ہنس کے بولی۔

"ہمیں تو نہیں مگر وہ جو آدمی سامنے والی میز پر بیٹھا ہے، وہ تمھارے انتظار میں دو گھنٹے سے سوکھ رہا ہے— جاؤ پہلے اس کی خبر لو، کہیں وہ سچ مچ میں کرسی سے گر کے بے ہوش ہی نہ ہو جائے۔" ناصر نے کہا۔

مرجینا نے اس آدمی کی میز پر جا کے اس سے ہاتھ ملایا اور حال چال پوچھا پھر کچھ ہی دیر بعد اسے رخصت کر کے واپس ان کی میز پر آ گئی، "کہہ رہا تھا ان کے شاپنگ مال میں فلسطینی دست کاریوں کے ایک شو روم کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے، میں جس کی تیاری کے لیے اسے مشورے دوں اور پھر اس کا افتتاح بھی کروں۔" مرجینا نے کہا۔

"تو تم نے کیا مشورہ دیا؟" ناصر نے پوچھا۔

مرجینا ہنسی، "صرف دو مشورے— ایک تو اس دکان کا نام لیلیٰ خالد کے نام پر رکھا جائے کیوں کہ اس بہادر خاتون نے اپنے کارنامے سے فلسطین کے مسئلے کو دنیا بھر میں اجاگر کر دیا اور دکان کا افتتاح کسی بااثر فلسطینی شخصیت سے کرایا جائے۔"

لتا نے کہا، "تمھارا مطلب ہے یاسر عرفات سے، بھئی انھیں تو مرحوم ہوئے کئی سال ہو گئے۔"

مرجینا نے کہا، "ظاہر ہے وہ تو ملکِ عدم سے آنے سے رہے، البتہ احمد القرقاوی نے میرے کہنے پر فلسطینی سفیر کو یہ ذمے داری سونپنے کا ارادہ ظاہر کیا ہے۔"

"چلو یہ وار تو اس کا خالی گیا۔" لتا نے شوخی سے کہا، "تم پھر بھی اس سے شادی کرو گی؟"

’’یہ خوب سوال ہے!‘‘ مرجینا مسکرائی، ’’کیا یہ میرے انٹرویو کا حصہ ہے؟‘‘

’’انٹرویو شروع ہو چکا ہے —‘‘ لتا بولی، ’’پہلا سوال یہی تھا۔‘‘

’’او کے —‘‘ مرجینا مسکراتی ہوئی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ بیرے نے مستعدی سے کافی کے کپ سب کے آگے سجا دیے۔

’’تو جواب دو۔‘‘ لتا نے کہا، ’’میں نے سنا ہے کہ یہ صاحب کیا نام ہے ان کا، ابھی تم نے لیا تھا — احمد القرقاوی، شاید — تو یہ صاحب تم سے شادی کرنے کو بے تاب ہیں — اور کافی سنجیدہ ہیں۔‘‘

مرجینا نے جواب دیا، ’’اگر حقیقت دیکھی جائے تو ان کا کیس کافی مضبوط ہے، اس لیے کہ کافی نمایاں خاندان ہے ان کا، مقامی سیاست میں — روپے پیسے کی بھی کمی نہیں — اپنے ہم عمر دوسرے لفنگوں کی طرح شادی برائے شادی کے قائل نہیں اور اپنے لیے بیویوں کا اصطبل کھولنا نہیں چاہتے — مگر میں نے ابھی کچھ سوچا نہیں — اس کے لیے مجھے اپنے دل کو ٹٹولنا پڑے گا۔ ویسے بھی فی الحال میری دل چسپیاں ذرا مختلف ہیں۔‘‘

لتا نے موضوع بدل دیا اور وہ الف لیلہ تھیٹر اور اس کے آنے والے مختلف کھیلوں کے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔

کچھ دیر بعد ناصر نے کہا، ’’اچھا تم لوگ باتیں کرو، میں چلتا ہوں، مجھے اس وقت کچھ اور جگہوں پر بھی جانا ہے۔‘‘

لتا نے کہا، ’’تم کیلاش سے ملو تو اس سے ذرا ’ہارٹ ٹو ہارٹ‘ بات کرو — دیکھو پاگل آدمی کیا کہتا ہے۔‘‘

مرجینا بھی ناصر کی طرف مڑی — ’’ارے سنو، مصطفیٰ غوباش نے تمھارا شکریہ ادا کیا ہے، تمھاری مدد سے فلسطینی تحریک کے لیے عطیات جمع کرنے کا کام بہت آسان ہوگیا، خاص طور پر ابوعبید نے بڑی مدد کی۔

ناصر، ابوعبید کے دفتر پہنچا تو وہاں باہر ہی نائر سے ملاقات ہوگئی۔ اس نے بتایا کہ ابوعبید نے ’سلطان البحر‘ کو بیچ دیا ہے اور وہ اب اس کی جگہ ایک جدید ہوور کرافٹ خرید رہا



ہے۔ ’’وہ کس لیے؟‘‘ ناصر نے پوچھا۔

نائر نے کہا، ’’اس کا ارادہ ہے کہ اب وہ دُبئی اور بصرے کے درمیان مسافروں کے لیے جہازی سروس شروع کرے گا۔‘‘

ابھی وہ باتیں ہی کر رہے تھے کہ ابوعبید اپنے دفتر سے باہر نکلے۔ ’’ارے تم ہو —‘‘ انھوں نے لپک کے ناصر سے کہا، ’’کیا ہو رہا ہے؟‘‘

’’ہوگا کیا؟‘‘ ناصر نے جواب دیا، ’’روز کوئی نہ کوئی حیرت ناک خبر سننے کو مل رہی ہے — سنا ہے آپ نے ’سلطان البحر‘ کو بیچ دیا ہے۔‘‘

’’اندر آؤ دفتر میں۔‘‘ ابوعبید نے کہا، پھر پلٹ کے نائر سے بولے، ’’ذرا چائے منگواؤ اچھی سی۔‘‘

ناصر دفتر میں داخل ہوا تو ابوعبید نے اپنا سرپوش اتار کے ایک طرف رکھا اور قریبی رکھے صوفے پر ڈھیر ہوگیا۔ ’’یہاں آ کے بیٹھو میرے پاس۔‘‘ اس نے ناصر کو اشارہ کیا۔

’’بڑے تھکے ہوئے لگ رہے ہیں آپ؟‘‘ ناصر بولا۔

’’بس برادر وہی ناکامی پر ناکامی — کارخانہ گیا، پھر یہ جہاز — اچانک بینکوں کی حالت پتلی ہوگئی، قرضے دینے میں ہچکچانے لگے — سارے پروجیکٹس ٹھپ ہوگئے — مگر مجھے تو نئی کمپنی کھولنی ہے۔‘‘

’’ہاں، میں نے سنا ہے کہ آپ کوئی پسنجر شپنگ لائن شروع کرنے والے ہیں اور شاید کوئی ہوور کرافٹ خرید کر رہے ہیں؟‘‘

ابوعبید نے کہا، ’’دعا کرو، یہ کامیاب ہوجائے۔ نیا زمانہ ہے، نئی ضرورتیں ہیں، بزنس بھی نیا ہونا چاہیے۔‘‘

ایک آدمی چائے کی ٹرے لے کر اندر آیا۔ ابوعبید نے سامنے لگے واٹر کولر سے ٹھنڈا پانی نکال کے پیا اور بولا، ’’میرے باپ دادا موتیوں کے کام سے بہت خوش تھے مگر وہ غریبی میں بھی خوش رہنے کا زمانہ تھا۔‘‘

’’آپ نے نہیں کیا موتیوں کا کام؟‘‘ ناصر نے پوچھا، ’’سنا ہے ایک زمانے میں تو

یہاں بزنس کی ساری چمک دمک موتیوں سے تھی— آخر وہ سب موتیوں کی وادیاں کہاں گئیں، سمندر وہی ہے، موتی فروش بھی وہی ہیں، موتیوں کی قدر تو اب بھی بہت ہے۔"

ابوعبید نے کہا، "موتی تو ہیں مگر اب وہ عجائب گھر میں رکھنے کے لیے ہیں، خدا بھلا کرے جاپانیوں کا انھوں نے 'کلچرڈ پرل' کے بہانے ہمارا روزگار ہم سے چھین لیا۔ اب جو موتی ہیں ان سے بس میوزیم آباد ہو رہے ہیں۔"

پھر وہ رکے اور انھوں نے ناصر سے پوچھا، "تم نے دیکھا ہے بینک الوطنی میں موتیوں کا عجائب گھر؟ کسی دن لے چلوں گا— میں تو بچپن سے موتیوں میں کھیلا ہوں۔"

ناصر نے کہا، "جب آپ اتنا زیادہ جانتے ہیں اس کے بارے میں تو دوبارہ اس کاروبار کو زندہ کیوں نہیں کرتے؟"

ابوعبید ہنسا، "وقت نے سمندر کی تہوں میں چھپے موتیوں کے اس خزانے پر جھاڑو جو پھیر دیا ہے— جہاں ہم پہلے سیپیاں اکٹھا کرنے جاتے تھے، وہاں تیل کے چشمے ہیں اب۔"

"اچھا تو سیپیوں کا شکار اب کوئی نہیں کرتا یعنی 'گوہر گیری'؟" ناصر نے پوچھا۔

ابوعبید نے اپنے دفتر میں رکھی ہوئی کتابوں کی ایک الماری سے بڑا سا انسائیکلوپیڈیا باہر نکالا، "میں تمھیں بتاؤں 'گوہر گیری' کیا ہوتی تھی!" اس نے کتاب میں ایک نقشہ ناصر کو دکھایا، "دیکھو اس سارے خلیجی علاقے میں موتی بھرے سیپیوں کا خزانہ سمندر کی تہوں میں محفوظ تھا۔" اس نے ایک جگہ اپنی انگلی رکھی، "اور یہ کویت دیکھ رہے ہو— سات ہزار سال پہلے اسی جگہ موتی دریافت ہوئے تھے۔ بھئی ہم سب موتی والے لوگ تھے پہلے، تیل والے تو اب بنے ہیں۔"

ناصر نے کہا، "الف لیلہ تھیٹر والوں نے 'خوش حالی کا جن' کے نام سے اس موضوع پر ایک کھیل بھی تو پیش کیا ہے۔"

ابوعبید ہنسا، "یہ کھیل نہیں زندگی ہے۔ اب سچ مچ میں یہاں خوش حالی کے جن آ گئے ہیں جو شیشے کے گھروں میں رہتے ہیں۔"

"شیشے کے گھر—؟" ناصر حیران ہوا۔



"ہاں بھئی—" ابوعبید نے تلخی سے کہا، "ریگستان میں سجے ہوئے شیشے کے گھر، ان کی چمک اب موتیوں سے زیادہ ہے، اصل موتیوں کو اب کون پوچھتا ہے— ہاں ایک زمانہ تھا جب ہم کشتیوں میں سوار ہو کے دور دور جاتے تھے 'گوہر گیری' کو۔" ابوعبید کی آنکھوں میں پرانے خواب جاگ اُٹھے۔

ناصر نے پوچھا، "کن دنوں میں موتی زیادہ ہاتھ آتے تھے؟"

ابوعبید نے جواب دیا، "گوہر گیری کا بھی ایک سیزن ہوتا ہے، وسطِ مئی سے وسطِ ستمبر تک، اس کے بعد 'القفل' یعنی خاتمہ۔ لو چائے پیو۔" اس نے کہا اور چائے کا گھونٹ بھرا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ 'القفل' کی آمد سے پہلے سیپیوں کی وادیوں میں بڑی چہل پہل رہتی ہوگی، کشتیوں اور ملاّحوں کی؟" ناصر نے پوچھا۔

"بالکل۔" ابوعبید نے اسے ایک بار پھر نقشہ دکھایا، "اس سارے علاقے میں ہزار بارہ سو کشتیاں موتیوں کی کھوج میں دوڑتی پھرتی تھیں اور ہر کشتی میں تیس سے لے کر سو ملاّح تک سوار ہوتے جن میں سردال یعنی مہم کے سربراہ، ناخدا کشتی کا رہبر، الجادی اس کا نائب، الجادی ملاّحوں کا سربراہ، غواص غوطہ خور، الصائب غوطہ خوروں کو رسّی کی مدد سے اوپر کھینچنے والے اور الجلسہ یعنی تمام دوسرے ملاّح جو مختلف قسم کی ذمے داریاں نبھاتے تھے، سب ہی شامل ہوتے تھے۔"

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ بڑی رونق رہتی ہوگی کشتیوں پر۔" ناصر نے کہا۔

"کیوں نہیں۔" ابوعبید نے کہا، "کشتیوں میں 'الردیف' بھی ہوتے ایسے نوعمر لڑکے جو غواصی کی تربیت پا رہے ہوتے تھے اور 'نہام' گویے جو اپنے پُرجوش گیتوں سے غواصوں کی ہمت بڑھا رہے ہوتے۔ ہر غواص پانچ پانچ منٹ کے وقفے سے دس بار سمندر میں تہ میں غوطہ لگاتا اور وہاں سے سیپیاں بٹور کے کشتی میں لے آتا۔"

ناصر نے پوچھا، "کسی غوطہ خور کو ڈر نہیں لگتا تھا پانی کے اندر کہ شاید وہاں کوئی خوفناک سمندری جانور اس کی تاک میں بیٹھا ہو یا کوئی جن؟"

ابوعبید ہنسا، "نہیں بھئی، غواص تو خود کسی جن سے کم نہیں ہوتے۔ وہ پچیس سے تیس

گز کی گہرائی میں اتر کے ساڑھے تین منٹ تک پانی میں رہتے اور پھر انھیں اوپر کھینچ لیا جاتا تاکہ وہ سانس لے سکیں۔ ان کے پاس آکسیجن کے سیلنڈر کے بجائے تین قسم کی رسیاں ہوتی تھیں جنھیں 'القلط'، 'الزیبل' اور 'العیدہ' کہا جاتا ہے۔ 'القلط' رسّی کا وہ ٹکڑا ہے جو کشتی سے بندھا رہتا ہے اور اس کے سہارے غوطہ خور پانی میں اترنے سے پہلے پھیپھڑوں میں ہوا بھرتا ہے، 'الزیبل' نامی رسّی میں بھاری وزن بندھا ہوتا ہے جو غواص کو تیزی سے پانی میں اترنے میں مدد دیتا ہے اور 'العیدہ' ایک طرح سے مواصلاتی رسّی ہوتی ہے جسے ہلا کے غواص کشتی میں موجود 'الصائب' کو پیغام بھیجتا ہے کہ اب اسے اوپر کھینچ لیا جائے۔ غواص کی گردن سے ایک جالی دار ٹوکری بھی لٹکی ہوتی ہے جسے 'دعین' کہتے ہیں، اس میں سیپیاں جمع کی جاتی ہیں۔ جب سیپیاں کشتی میں ڈھیر کی جاتی ہیں تو انھیں چیر کے موتی نکالے جاتے ہیں، ان میں ہر طرح کے موتی ہوتے ہیں، چھوٹے بڑے اور بعض دُرِ نایاب اور دُرِ یکتا۔"

ناصر نے کہا، "تو اب کیوں نہیں نکالتے — اتنی تو آسانیاں ہیں اب، جدید ترین کشتیاں اور پشت پر آکسیجن ٹینک لادے غوطہ خور — جو اسکوبا ڈائیور کہلاتے ہیں، ان کے ملبوسات بھی واٹر پروف ہوتے ہیں۔"

"سچ ہے پہلے یہ عیاشی کہاں تھی۔" ابوعبید نے کہا، "پہلے تو غواص عام سوتی لباس پہنتے تھے، بس ہاتھ کی انگلیوں پر 'الخبط' نامی چمڑے کے خول چڑھائے رکھتے تھے تاکہ وہ نوکیلے پتھروں اور سیپیوں کے کناروں سے زخمی ہونے سے محفوظ رہیں، اسی طرح وہ ناک پر کچھوے کی ہڈی سے بنے ہوئے کلپ جنھیں 'الفطم' کہتے ہیں، چڑھائے رکھتے تاکہ پانی ناک کے اندر نہ جائے — اصل میں یہ کاروبار نہیں عشق کا اظہار تھا سمندر سے اور موتیوں سے مگر اب محبوب بدل گیا ہے ہمارا — جب سے 'القفل' کا اعلان ہوا یعنی موتیوں سے محبت کا سیزن رخصت ہوا۔" ابوعبید نے چائے کی پیالی کو ایک طرف کھسکایا اور افسردگی سے بولا، "پہلے خوش حالی ہنر تھی، اب خوش حالی ہوس بن چکی ہے۔"

ناصر نے بھی چائے کی پیالی میز پر رکھی اور بولا، "آپ نے خوش حالی کے جن سے کوئی کام کیوں نہیں لیا؟"



ابوعبید نے قہقہہ لگایا، "میرا خوش حالی کا جن تو بس کشتیوں اور جہازوں میں رہتا ہے، کیا پتا جس دن میں 'ہوور کرافٹ' لے کر اپنے پہلے سمندری سفر پر نکلوں وہ اچانک سامنے آ کھڑا ہو اور گونجتی ہوئی آواز میں کہے، "کیا حکم ہے میرے آقا؟"

---

ابوعبید سے ملنے کے بعد ناصر باہر نکلا تو نائر نے اسے اپنے کمرے میں آنے کو کہا مگر ناصر نے کہا کہ اس وقت اسے کیلاش رام چندانی سے ملنے اس کے دفتر میں جانا ہے جو ڈیرہ کے ایئر لائن سینٹر میں واقع ہے۔

"کہو تو میں تمھیں اپنی گاڑی میں چھوڑ آؤں وہاں؟" نائر نے پوچھا۔

"نہیں یار۔" ناصر بولا، "میں عبرہ یا پھر بس سے چلا جاؤں گا۔"

"عبرے سے جاؤ گے تو تمھیں کافی پیدل چلنا پڑے گا، بس ٹھیک رہے گی، اس کے دفتر کے سامنے ہی تو بس اسٹاپ ہے۔" نائر نے مشورہ دیا۔

"عبرہ مجھے پسند ہے۔" ناصر نے کہا، "سمندر کی نمکین ہوا کا ذائقہ منہ میں گھلتا ہے تو کشتی پر قطار میں بیٹھے سب لوگوں سے خود بخود ایک برادرانہ اُنسیت سی پیدا ہو جاتی ہے جیسے سب ایک دسترخوان پر بیٹھے ہوں۔"

نائر ہنسا، "تم ٹھہرے ایک فلسفی، ہر شے میں کوئی معنویت ڈھونڈ لیتے ہو۔"

ناصر نے کہا، "میں کیلاش سے ملنے عبرے میں یوں جانا چاہتا ہوں کہ اسے بھی یہ سواری پسند ہے۔ وہ کہتا ہے کھلی کشتی میں سمندر کی اونچی اونچی لہروں کو پار کرنا زندگی کی حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنا ہے۔ عبرہ تو زندگی کی کھلی کتاب ہے، آپ اس میں کبھی چھپ نہیں سکتے، نہ ہی کچھ چھپا سکتے ہیں — مختصر مگر سچا سفر — اس پر سفر کرنے والوں کو یہ پتا ہوتا ہے کہ کشتی کے رُکتے ہی انھیں الگ الگ راستوں پر چلے جانا ہے۔" کیلاش نے بھی کچھ چھپایا نہیں تھا۔ اس نے لتا کو بتا دیا تھا کہ وہ اسے پسند کرتا ہے مگر وہ لمبا ساتھ چاہتا تھا، عبرے کے مسافروں والا ساتھ نہیں — مگر لتا — وہ اسے قزاق سمجھتی تھی۔

ناصر کیلاش کے دفتر پہنچا تو کافی شام ہو چکی تھی۔ لوگ دفتروں سے نکل رہے تھے۔

نیچے لفٹ کے پاس ہی اس کی ملاقات کیلاش کے دفتر کے ایک ساتھی سے ہوگئی۔

ناصر نے پوچھا، ''کیلاش ابھی دفتر میں موجود ہے یا چلا گیا؟''

''کون؟ وہ نقشہ ساز جو اونچی اونچی عمارتوں کے نقشے تیار کرتا ہے اور فرصت میں پیانو بجاتا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، ہاں وہی — '' ناصر نے کہا، ''کیلاش آرکی ٹیکٹ۔''

''وہ تو چلا گیا — بلکہ یوں کہو کہ بالکل چلا گیا۔'' کیلاش کا ساتھی بولا۔

''کیا مطلب؟ میں سمجھا نہیں۔'' ناصر نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ — '' وہ آدمی بولا، ''کل اچانک اس کی نوکری ختم ہوگئی، اچھا آدمی تھا بے چارہ۔'' اس نے تأسف کا اظہار کیا۔ دکھ اور صدمے کی ایک اونچی لہر ناصر کو سر سے پاؤں تک بھگا گئی۔



# ۳۰

# تلوار کا نغمہ

ناصر اپنے تین ہٹی والے گھر کے برآمدے میں پلنگ پر بیٹھا اپنے بھتیجے عرفان کے ساتھ لوڈو کھیل رہا تھا۔ لوڈو ان دونوں کے بیچ میں رکھا تھا اور ہری اور پیلی گوٹیں سانپ اور سیڑھی کی زد میں تھیں۔ ناصر کو جب بھی آگے بڑھنے کا موقع ملتا اور وہ کسی سیڑھی تک پہنچتا فوراً ہی کوئی اژدھا آگے بڑھ کے اس کی گوٹ کو ہڑپ کر لیتا۔

ناصر نے عرفان سے کہا، ''اگر تمھارے سانپوں نے اب کے میری کوئی گوٹ ہضم کی تو دیکھنا میں خود اژدھا بن جاؤں گا اور تمھیں ہڑپ کر جاؤں گا — ہا — ہو!'' اس نے ہاتھ پھیلا کے منہ سے بڑی ڈراؤنی سی آواز نکالی۔ عرفان کا منہ فق ہوگیا اور وہ ڈر کے بولا، ''نہیں، نہیں — چاچو — پلیز آپ ایسی شکل تو نہ بنائیں، مجھے ڈر لگ رہا ہے!'' وہ روہانسا ہوگیا۔ ''ہت ترے کی — '' ناصر ہنسا، ''بڑے ڈرپوک ہو یار — '' پھر اس نے بھابی کو پکارا، ''بھابی، اے بھابی — ذرا اپنے اس لاڈلے کو تو دیکھیے۔''

''کیا ہوا؟'' بھابی باورچی خانے میں سے نکلیں اور اپنے گیلے ہاتھوں کو ساری کے پلّو سے پونچھتے ہوئے بولیں۔

''ہونا کیا تھا، میں نے مذاق ہی مذاق میں کہا کہ میں اژدھا بن کے تمھیں کھا جاؤں

گا تو اس کے ہوش اُڑ گئے — واللہ کیا ڈرپوک بیٹا پیدا کیا ہے آپ نے۔''

بھابی ہنس پڑیں اور اُن کے گالوں میں شوخ رنگ کے قمقمے جل اٹھے۔

''چلو میرا بیٹا تو ڈرپوک سہی مگر یہ جو اس کے چاچو ہیں نا — ان کی بہادری بھی دیکھ چکی ہوں میں۔'' انھوں نے پیار سے اس کے سر پر چپت لگائی۔ ناصر جاگ اٹھا، کھلی کھڑکی سے ہوا کے جھونکے کے ساتھ پیڑ کا ایک پتا اس کے سر پر آ کے گرا تھا۔ ناصر نے کھڑکی بند کردی اور سوچنے لگا کیسے عجیب خواب آتے ہیں بعض دفعہ — بھابی اور بھتیجے کو یاد کر کے اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ناصر دیر تک لیٹا یہ سوچتا رہا کہ کیا واقعی ایسا ممکن ہے کہ لوگ اپنی جون بدل سکیں، کبھی اژدھا بن جائیں، کبھی شیر اور کبھی خوب صورت سا ہرن۔ سنتے ہیں بعض سادھوؤں کو ایسے منتر معلوم تھے جن سے —

ناصر ہفتے بھر سے بیمار تھا۔ شدید بخار کی وجہ سے وہ کام پر بھی نہیں جاسکا تھا۔ نائر اس کے گھر آ کے اسے دوائیں دے گیا تھا۔ دو ایک دوستوں نے اسے فون کیا اور خیریت معلوم کی، ان میں مرجینا، لتا اور دلبر پاکستانی شامل تھے۔ وہ بس گھر میں لیٹا سوتا اور خواب دیکھتا رہا۔ اس وقت بھی اچانک اسے پھر سے نیند نے آدبوچا اور اس نے ایک بار پھر خواب دیکھنا شروع کیا۔ اس بار وہ اپنی کمپنی کے گودام میں پہنچ گیا۔ اس نے دیکھا ٹرک پر سامان لادا جا رہا ہے — لکڑیوں کے کھوکھے، گتے کے ڈبے اور بوریاں — وہ انھیں کھول کے دیکھتا ہے اور حیران ہوتا ہے — کسی کھوکھے میں سانپ ہیں تو کسی میں مکڑیاں اور کسی میں کلبلاتے بچھو۔ وہ گھبرا کے اٹھ بیٹھا۔

صبح ہوگئی تھی پھر بھی کمرے میں حبس تھا اور پنکھے سے گرم ہوا خارج ہو رہی تھی۔ ناصر اٹھ بیٹھا اور دیر تک اپنے بے تکے خوابوں کے بارے میں سوچتا رہا۔ آج اس کی طبیعت بہت بہتر تھی، لہٰذا وہ بستر سے اٹھا اور نہانے چلا گیا۔ پھر وہ عام دنوں کے مقابلے میں ذرا پہلے کام پر جانے کے لیے گھر سے نکل آیا۔ ابھی بازار نہیں کھلا تھا اور دکانیں بند تھیں مگر بس سے اترتے ہوئے اسے اس سڑک پر جہاں فریدون خستہ تن کی دکان اور مال گودام واقع تھے



ہنگامی صورتِ حال نظر آئی۔ پولیس کی بہت سی گاڑیاں اور آگ بجھانے کے انجن وہاں موجود تھے اور پولیس اور فائر بریگیڈ کے جوانوں نے سارے علاقے کو گھیر رکھا تھا۔

وہ ذرا گھبرا کے آگے بڑھا تا کہ پتا کرے کہ ماجرا کیا ہے کہ اسے سامنے سے پپی سنگھ بادل آتا دکھائی دیا جو ہفتے بھر پہلے ہی اپنا ٹرک لے کر صلالہ اور مسقط سے دبئی واپس پہنچا تھا۔ بادل نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا اور قریب آ کے بولا، ''آگے مت جائیں رات گودام میں آگ لگ گئی جس سے اندر باہر سارا مال جل کے راکھ ہوگیا اور احاطے میں کھڑے ٹرک، ارباب کا تو دیوالیہ نکل گیا ہے۔''

ناصر نے کہا، ''چلو خستہ تن سے تو ملتے ہیں۔''

بادل نے کہا، ''اسے ڈھونڈنا بیکار ہے، پولیس بھی اس کی تلاش میں ہے مگر اس کا کچھ پتا نہیں، لوگوں کا خیال ہے کہ وہ راتوں رات کہیں فرار ہوگیا ہے — پولیس نے آگ بجھ جانے کے بعد دکان، گودام اور سارے دفاتر کو تفتیش کے لیے تالا لگا دیا ہے۔''

ناصر بولا، ''چلو اچھا ہوا، کم از کم اس وقت سمندر خان کا ٹرک تو سعودی عرب میں ہے اور راجا بھی، بس بجل یہاں تھا، وہ پتا نہیں کہاں ہوگا اس وقت؟''

بادل نے کہا، ''اس کے متعلق بھی سنا ہے کہ روپوش ہے، بہت سے لوگ کچھ عجیب سی باتیں کر رہے ہیں۔''

''کیسی باتیں؟'' ناصر نے پوچھا۔

بادل نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا، ''سنا ہے سعودیہ میں سمندر خان کا ٹرک پکڑا گیا ہے دس دن پہلے اور راجا اور ڈرائیور دونوں قید میں ہیں۔''

''مگر کیوں؟'' ناصر پریشان ہوا۔

''اس لیے کہ وہاں اخروٹوں میں افیون اور حشیش چھپا کے لے جائی جا رہی تھی۔'' بادل نے جواب دیا۔

''میرے خدا —'' ناصر بولا، ''تبھی تو۔''

''تبھی تو کیا؟'' بادل نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

"وہ لوگ یہ کام گودام کی بالائی منزل میں کرتے تھے جہاں کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی، مجھے بھی نہیں — بس بند پیٹیاں اوپر سے آتی تھیں اور کنٹینروں میں لاد دی جاتی تھیں، بجل اور راجا کی نگرانی میں —" ناصر نے کہا۔

پپی سنگھ بادل نے کہا، "ہمارے لیے اب یہی اچھا ہے کہ یہاں سے دور رہیں — میں نے مسقط سے آتے ہی یہ نوکری چھوڑ دی تھی — اور آج رات کی فلائٹ سے وطن واپس جا رہا ہوں۔" وہ ناصر سے ہاتھ ملا کے عبرے کے گھاٹ کی طرف چلا گیا۔

ناصر نے ٹیکسی پکڑی اور ابوعبید کے دفتر کی طرف روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کے جیسے ہی وہ ابوعبید کے کمرے میں داخل ہوا، ابوعبید نے نعرہ لگایا — "لو آ گیا میرا شیر، یہ دیکھو۔"

ایک موٹا سا آدمی ابوعبید کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ ناصر کو لگا جیسے اس نے اسے پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔ ابوعبید نے کہا، "یہ رہا ناصر، میرا دوست — مگر یہ ویسا ہرگز نہیں جیسا تم سمجھ رہے ہو۔"

"مگر یہ کام تو وہیں کرتا تھا نا —" موٹا بولا، "مگر مجھے پتا ہے ان کے کاروبار سے اس کا کوئی واسطہ نہیں تھا۔" ابوعبید نے اسے یقین دلایا، "یہ بہت اچھا اور ایمان دار آدمی ہے، میں اس کی پوری ضمانت دے سکتا ہوں۔"

"میں آپ کی بات پر یقین کرنے پر مجبور ہوں۔" موٹے نے کہا، "مگر مجھے ان سے پوچھ گچھ تو ضرور کرنا ہوگی۔ مجھے امید ہے کہ یہ سرکاری گواہ بن کے قانون کا ساتھ دیں گے، اس میں ان کا بھی فائدہ ہے، مجھے پتا ہے کہ ان کے اپنے بھی کچھ مسائل ہیں، میری بات سمجھ رہے ہیں نا آپ؟"

ناصر نے حیرانی سے دونوں کو دیکھا اور پوچھا، "کوئی گڑبڑ ہوگئی ہے کیا مجھ سے؟"

ابوعبید نے جواب دیا، "ہم تمھیں بتاتے ہیں۔" پھر وہ دوسرے آدمی کی طرف اشارہ کرکے بولا، "یہ ہیں خفیہ پولیس کے انسپکٹر خالد خلفان جو تمھارے بارے میں پوچھ گچھ کرنے آئے ہیں، اصل میں تمھارے فریدون خستہ تن نے بڑے گڑبڑ کر دی ہے۔"

ناصر نے اب غور سے انسپکٹر خلفان کو دیکھا اور اسے یاد آ گیا کہ وہ ایک بار موکھی کے



شیشہ خانے میں اسے نظر آیا تھا۔

"خستہ تن کی دکان اور گودام میں آگ لگ گئی ہے۔" ناصر نے کہا۔

"آگ لگی نہیں، لگائی گئی ہے۔" انسپکٹر خلفان نے انکشاف کیا، "مجھے پتا چلا ہے کہ تم بھی وہاں کام کرتے تھے۔"

"تھوڑے دنوں سے!" ناصر نے وضاحت کی، "مگر میں صرف لاریوں کے آنے جانے کا ریکارڈ رکھتا تھا وہاں۔"

"پھر تو تمھیں پتا ہوگا کہ ان لاریوں میں کیا کیا مال جاتا تھا بیرونی ملکوں کو؟" انسپکٹر نے اسے گھورا۔

"نہیں —" ناصر نے کہا، "یہ کام خستہ تن کے دو کاروباری پارٹنر کرتے تھے، بجل اور راجا۔ ان دونوں کے اصل نام خیرا اور شکورا ہیں — راجا تو پچھلی بار مال کے ساتھ ہی جدہ گیا تھا، بجل شاید یہیں پر ہے۔ پچھلے ایک ہفتے سے میں بیماری کی وجہ سے اُدھر نہیں گیا، اس لیے مجھے کچھ پتا نہیں کہ وہاں کیا ہوا۔"

انسپکٹر خلفان مسکرایا، "سعودیہ میں تو وہ لوگ پکڑے گئے، سرحد پر کنٹینر ٹرک پر چھاپا پڑا تو اندر سے ایسی پیٹیاں نکلیں جن میں اخروٹ تھے اور اخروٹ میں حشیش — یہاں دکان کے مالک خستہ تن کی تلاش جاری ہے مگر شاید وہ فرار ہوگیا ہے — مگر اس کا بزنس پارٹنر پکڑا گیا ہے — کیا نام بتایا تم نے — بجل عرف خیرا، یہی نا؟ وہیں عجمان کے ساحل پر واقع شیشہ خانے میں جہاں شیشہ بھی چلتا ہے اور حشیش بھی۔"

"اچھا تو آپ نے دیکھا ہے، موکھی کا شیشہ خانہ —" ناصر بولا، "نشہ کرنے والوں کا فری زون!"

"ہاں کیوں نہیں!" انسپکٹر خلفان بولا، "ہر جگہ جانا پڑتا ہے ہمیں — اور وہاں تو ہمارے بہت سے مقامی نوجوان بھی مستیاں کرتے نظر آتے ہیں، ان سے تو ہمارے جیل خانوں کی رونق بڑھ گئی ہے — وہیں وہ بھی پکڑا گیا — خستہ تن کا کاروباری ساتھی — کہتا ہے وہ کوئی ساز بجاتا ہے وہاں عجیب سا۔"

ناصر نے کہا، ''کیا میں مل سکتا ہوں اس سے؟''

''ضرور—'' انسپکٹر خلفان نے کہا، ''تمھاری نیک چلنی کی ضمانت تو ابوعبید نے دی ہے لیکن میں چاہتا ہوں تم ہماری مدد کر کے اسے ثابت کرو۔ تمھیں بیجل سے پوچھنا ہوگا کہ اس کا کاروبار کہاں تک پھیلا ہوا ہے اور یہ بھی کہ خستہ تن کہاں روپوش ہے۔''

انسپکٹر خلفان ناصر کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا جہاں بیجل حوالات میں بند تھا۔ ناصر نے کہا کہ وہ بیجل سے بات کرنا چاہے گا۔ ''ٹھیک ہے!'' انسپکٹر خلفان نے کہا، ''میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔''

انسپکٹر خلفان اور ناصر کو بیجل کے پاس پہنچا دیا گیا۔ بیجل ایک میز کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں مُندی ہوئی تھیں اور چہرے پر تشدد کے نشانات تھے۔ اس کا منہ سوجا ہوا تھا۔ ناصر بیجل کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ انسپکٹر خلفان کھڑا رہا۔

''بیجل!'' ناصر نے اسے دھیرے سے پکارا۔ بیجل نے آنکھیں کھولیں اور نشے میں ڈوبی ہوئی اجنبی آواز میں کہا، ''کب تک اپنا ساز بجاؤں میں، کتنے راجا اپنا سر دان کریں گے؟''

''یہ تم کس ساز اور کس راجا کی بات کر رہے ہو بیجل! ہوش میں آؤ۔'' ناصر نے کہا۔

''اس راجا کی جس نے وہ ساز سنا اور مست ہوگیا۔ پھر وہ کاندھوں پر اپنا سرِ پُرغرور اٹھائے خوشی خوشی وہاں گیا اور تلوار کے ایک ہی وار سے...!'' بیجل چپ ہوگیا۔ انسپکٹر خلفان نے خوش ہو کے کہا، ''یہ اپنے ساتھی کی بات کر رہا ہے، سعودیہ میں منشیات اسمگل کرنے کے جرم کی پاداش میں کل نمازِ ظہر کے بعد جس کا سر قلم کر دیا گیا!''

بیجل نے اپنا سر میز پر ٹکا دیا اور سو گیا۔

ناصر بولا، ''لگتا ہے، اب اس کی روح سوتے میں اسے کوئی انوکھا نغمہ سنا رہی ہے۔''

انسپکٹر خلفان مسکرایا اور پھر اس نے صوفیوں جیسی فرزانگی سے کہا، ''ہر نشے کی اپنی جان لیوا موسیقی ہوتی ہے۔''

○

## ۳۱

# بُری خبروں کا عجائب گھر

ناصر الکرامہ میں اپنا فلیٹ خالی کر کے دلبر پاکستانی کے ڈیرے پر منتقل ہوگیا تھا جو شہر کے پرانے علاقے میں واقع تھا۔ دلبر نے اخبار میں فریدون خستہ تن کی دکان میں آتش زدگی کے بارے میں تفصیلی رپورٹ پڑھی اور فوراً اس کے پاس چلا آیا۔

''چاہو تو میرے یہاں آجاؤ۔'' اس نے کہا، ''مجھے اپنے گھر کو بے گھر لوگوں کی سرائے کے طور پر استعمال کرنے پر خوشی ہوتی ہے۔''

''اور دیکھو— میں کرایہ کسی سے نہیں لیتا۔'' وہ بولا، ''کیوں کہ یہ مکان جس شخص کا ہے، وہ مجھ سے اس کا کرایہ نہیں لیتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ میں اس کی تین بیویوں کے پندرہ بچوں کو فی سبیل اللہ ٹیوشن پڑھاتا ہوں۔ البتہ بجلی کے بل میں مہمانوں کی شراکت کا میں بالکل برا نہیں مانتا، تم چاہو تو یہ ذمے داری لے سکتے ہو۔''

ناصر نے گھر دیکھا تو وہ بڑا اچھا تھا، صاف ستھرا، کمرے ٹھنڈے رکھنے کا معقول انتظام اور قالین کے فرش پر قطار میں بستر لگے تھے۔ ایک صحن بھی تھا جس میں کھجور کے دو پیڑ بھی تھے۔ دلبر کا کمرہ الگ تھا مگر عجیب کمرہ تھا، اس کی دیواروں پر اخباروں کی بڑی بڑی سرخیاں چسپاں تھیں، پاکستانی اخباروں کی اور یہ ساری سرخیاں قتل و غارت گری کی تھیں۔

فلاں جگہ اتنے آدمی مار دیے گئے، فلاں شہر میں فائرنگ کے نتیجے میں اتنے لوگ ہلاک، فلاں مقام پر بند بوری میں ایک نوجوان کی لاش پائی گئی، فلاں مسجد میں بم کا دھماکا، فلاں آدمی کو اس لیے مار دیا گیا کہ وہ سبز پگڑی پہنتا تھا اور اور فلاں شخص اس لیے کھیت رہا کہ وہ سبز پگڑی نہیں پہنتا تھا۔

ناصر حیران ہوا، ''یہ کیا میرے بھائی — یہ گھر ہے یا خبروں کا عجائب گھر؟''

''بُری خبروں کا عجائب گھر — میوزیم یا 'نیوزیم' جو سمجھو — یہاں سرخیاں نہیں سیاہیاں تمھیں دیکھنے کو ملیں گی — میں نے خبروں کا یہ 'ماتم گھر' اس لیے بنایا ہے کہ ہمیں یاد رہے کہ ہم کیوں جنت بدر ہوئے ہیں۔ میں نے عہد کیا ہے کہ میں اس انوکھے میوزیم کو اس وقت تک بڑھاتا چلا جاؤں گا جب تک کوئی ایسی خبر اخبار میں نظر نہیں آتی کہ کسی قاتل، غاصب یا لٹیرے کو اس کے کیے کی سزا دے دی گئی ہے، اس دن میں بُری خبروں کا میوزیم بند کردوں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔'' دلبر پاکستانی نے بڑی تفصیل سے ناصر کو اپنے منصوبے کے بارے میں بتایا۔ ناصر کو دلبر تھوڑا سا کھسکا ہوا مگر بڑا دل چسپ انسان لگا۔ اس کے ساتھ رہنے میں ناصر کو بڑا مزہ آیا۔

---

ابوعبیدہ کی نئی کمپنی نے کام کرنا شروع کردیا تھا۔ اس نے جو مسافر بردار جہاز راں کمپنی شروع کی تھی، اس کے جدید طرز کے ہوور کرافٹ ہفتے میں ایک بار دبئی سے بصرہ اور ایک بار دبئی سے بندرعباس جاتے تھے، کمپنی اچھی چل رہی تھی۔ ناصر نے پھر سے ابوعبیدہ کے ساتھ کام کرنا شروع کردیا تھا۔ اس کے سارے خط ابوعبید ہی کی معرفت آتے تھے اور سارے خط عمران کے ہی ہوتے تھے جو اسے اس کی بیٹی ماروی کے معاملات سے باخبر رکھتا تھا۔

عمران گاہے گاہے ماروی کی تصویریں بھی بھیجتا رہتا جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ ماروی تیزی سے اپنی شکل بدل رہی ہے۔ اور آج تو اسے جو خط ملا اس میں ایک ایسی لڑکی کی تصویر تھی جسے وہ نوری کے نام سے جانتا تھا، نوری اس کی محبت، اس کی بیٹی کی ماں، جسے دشمنوں نے اس سے چھین لیا تھا۔



''حیران مت ہو میرے دوست!'' عمران نے لکھا تھا، ''یہ تمھاری بیٹی ماروی ہے۔ میں نے اور تمھاری بھابی ویرا نے اسے بہت محنت اور بہت پیار سے پالا ہے۔ ویرا کا ہمیشہ سے یہ خیال تھا کہ لڑکیوں کو بہت مضبوط اور بہادر ہونا چاہیے تاکہ وہ زندگی کے خطرات سے اچھی طرح نمٹ سکیں اور اس دنیا میں جو قزاقوں اور قاتلوں سے بھری ہے، سر اٹھا کے جی سکیں — اس لیے بچپن سے ہی ہم نے اسے ایسی تربیت دی ہے کہ وہ ہر صورتِ حال کا عورت بن کے نہیں مرد بن کے مقابلہ کرسکے۔ تمھیں یہ سن کے خوشی ہوگی کہ اُس نے اسکول اور کالج ہر جگہ ہم سب کا نام روشن کیا ہے۔ وہ کراٹے چیمپئن ہے اور موٹر سائیکل ویرا کی طرح چلاتی ہے۔ ویرا اسے اپنی طرح موٹر سائیکل کی شہسوار بنانا چاہتی تھی تاکہ وہ ہر روز موت کے کنویں کو اپنے قدموں تلے روند سکے۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اپنی بہادر بیٹی پر ہمیشہ فخر رہے گا۔ اللہ کرے تم جلد سے جلد اسے دیکھ سکو۔

تمھارا دوست، بھائی اور ہم زاد

عمران

---

شام کے وقت ناصر، دلبر پاکستانی کے پاس بیٹھا تھا جو اخبار پڑھ رہا تھا۔ اچانک اس نے کہا، ''سنو کل یہاں فلسطینی دست کاریوں کی نمائش ہے ایک شاپنگ مال میں — چلو گے؟ دیکھیں تو سہی کہ فلسطین میں الفتح اور حماس کے علاوہ اور کیا بنتا ہے؟''

''اچھا — ہاں۔'' ناصر بولا، ''اب مرجینا تو شاید اس کا افتتاح نہ کرے مگر چلیں گے اسے دیکھنے۔''

مرجینا کون؟'' دلبر پاکستانی نے پوچھا۔

''تم اسے نہیں جانتے؟'' ناصر بولا، ''ایک فلسطینی لڑکی ہے، ہماری دوست۔''

''ارے وہ تو نہیں جو الف لیلہ تھیٹر میں کام کرتی ہے؟'' دلبر نے کہا، ''میں نے اس کے کئی ڈرامے دیکھے ہیں۔''

''اچھا —'' ناصر بولا، ''مگر آج کل وہ جس ڈرامے کی ہیروئن بنی ہوئی ہے اس کا

ہیرو اسی شاپنگ مال کے مالک کا بیٹا ہے، جہاں نمائش ہو رہی ہے۔ وہ اسے اپنے دائرۂ نکاح میں قید کر کے جدوجہدِ فلسطین کی الجھنوں سے آزاد کرانا چاہتا ہے۔"

دلبر پاکستانی ہنسا، "تب تو یہ ڈراما اور معنی خیز ہو گیا ہے۔"

شاپنگ مال کے جس حصے میں فلسطینی دست کاریوں کا شوروم بنایا گیا تھا، اس کے سامنے ہی تقریب کا انتظام تھا۔ فلسطینی سفیر بھی وہاں موجود تھے اور تنظیم کے نمائندے مصطفیٰ غوباش بھی — شوروم کے سامنے ایک ڈائس بنایا گیا تھا جس پر شیشے کی ایک میز پر مسجدِ اقصیٰ کی شکل کا کیک رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد مرجینا شاپنگ مال ایمپائر کے شہزادے احمد القرقاوی کے ساتھ ڈائس پر نمودار ہوئی۔ اس نے سفید رنگ کا لمبا گاؤن پہن رکھا تھا۔ کئی معزز مہمانوں کی معیت میں اس نے کیک کاٹا پھر نیچے اتر کے شوروم کے آگے لگا ہوا سرخ ربن سنہری قینچی سے قطع کیا۔ فلسطینی سفیر صرف تالیاں بجاتے رہے۔ سارے مہمان روشنیوں اور پھولوں کے ہجوم اور تالیوں کی گونج میں شوروم میں داخل ہوئے جس کا نام 'فلسطینی ورثہ' رکھا گیا تھا۔ طرح طرح کی مصنوعات اور دست کاریاں، دیواروں پر آویزاں تھیں یا شیشے کی الماریوں میں سجی ہوئی تھیں۔ ملبوسات، خطاطی کے نمونے، طغرے، منقش آئینے، سیپیوں سے بنی ہوئی سجاوٹی اشیا، مسجدِ اقصیٰ کے نمونے، فلسطینی لیڈروں کے عکس، فلسطینی پرچم۔

القرقاوی نے اپنی تقریر میں کہا کہ "اس شوروم میں فلسطین کے اندر یا فلسطین کے باہر رہنے والے تمام ہنرمندوں، دست کاروں اور فن کاروں کے شہ پارے فروخت کے لیے رکھے جائیں گے اور اس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو فلسطینی بچوں کے اسکولوں کے لیے بطور عطیہ پیش کیا جائے گا۔ مرجینا اس پورے منصوبے کی نگرانِ اعلیٰ ہوں گی۔"

دلبر نے کہا، "زبردست، اب تو تمھاری ممدوحہ کی شادی اس سلطنتِ شاپنگ مال کے شہزادے سے ہو کے رہے گی۔ اس نے ایسا خوب صورت جال بنا ہے کہ بے چاری اس میں سے نکل ہی نہیں سکتی۔"

اچانک مرجینا ناصر سے ٹکرا گئی، "مبروک —" ناصر بولا، "تمھاری دونوں تجاویز شہزادے نے رد کر دیں، نہ لیلیٰ خالد کا کہیں نام نظر آیا، نہ فلسطینی سفیر کی دال گل سکی، اب کیا ہوگا؟



مجھے لگ رہا ہے کہ تمھیں الف لیلہ تھیٹر کو چھوڑنا پڑے گا، تمھارے لیے تو خیر یہ اچھا ہوگا مگر ذاتی طور پر شاید مجھے یہ اچھا نہیں لگے گا کیوں کہ اب چوروں سے کون دو دو ہاتھ کرے گا؟"

مرجینا چپ رہی، پھر اس نے کہا، "یہ مت بھولو کہ میں بھی ایک انسان ہوں، میری بھی کچھ خواہشیں ہو سکتی ہیں۔"

ابھی یہیں تک بات پہنچی تھی کہ القرقاوی نے مرجینا کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور شوروم سے باہر لے گیا جہاں تقریب کے مہمان مسجدِ اقصیٰ کے جناتی کیک کے لذیذ قتلے نوشِ جاں کرنے میں مصروف تھے۔

تقریب سے باہر نکلتے ہوئے ناصر اور دلبر نے مرجینا کو القرقاوی کے ساتھ ایک عالی شان لیموزین میں روشنیوں سے منور شاہراہ پر تیز رفتار کاروں کے ہجوم میں گم ہوتے ہوئے دیکھا۔ دلبر پاکستانی نے ناصر سے کہا، "اچھا بھئی اب میں تو چلا 'جشنِ تاج پوشی' میں تم کدھر جاؤ گے؟"

ناصر حیران ہوا، "کیسا جشنِ تاج پوشی؟"

دلبر نے جواب دیا، "ایک انجمن ہے یہاں جو ہر سال پاکستان یا ہندوستان کے کسی ایک بڑے شاعر کا جشن مناتی ہے، اس موقعے پر شاعر کو سونے کا تاج پہنایا جاتا ہے، اس بار جون ایلیا کی باری ہے، کوئی شعر تمھیں یاد ہے جون بھائی کا؟"

ناصر نے کہا، "بھئی کسے ان کا یہ شعر یاد نہیں ہوگا کہ:

نمازِ خوف کے دن ہیں کہ ان دنوں یارو
قلندروں پہ فقیہوں کا خوف طاری ہے

جون بھائی تو خود قلندر ہیں مگر دوسرے قلندروں سے ذرا مختلف کہ ان پر سوائے اپنے خوف کے کسی اور کا خوف طاری نہیں ہوتا۔ اسی لیے عجیب عجیب سوال داغتے ہیں جن سے بعض اوقات فقیہانِ شہر کی پیشانیوں پر بل پڑ جاتے ہیں۔ تمھیں تو پتا ہی ہوگا کہ کراچی کے ایک مشاعرے میں ان کے ساتھ کیا ہوا تھا!"

دلبر پاکستانی ہنسا، "بس وہی ان کی سوال کرنے کی بری عادت — شعر بھی کیا کہتے

ہیں، کسی نئے سوال کا تازیانہ ہی مارتے ہیں:

یوں جو تکتا ہے آسمان کو تُو
کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا

ویسے ہے یہ سوچنے والی بات— کوئی رہتا ہے آسمان میں کیا؟ اگر کوئی رہتا ہوتا تو مصیبت زدوں کی مدد کے لیے نیچے ضرور اُترتا— نتیجہ محض بے بسی اور بے چارگی اور جون بھائی کو پھر کہنا پڑتا ہے:

کون اس گھر کی دیکھ بھال کرے
روز ایک چیز ٹوٹ جاتی ہے"

ناصر بولا، "کمال کا شعر ہے، جب گھر والے گھر کی دیکھ بھال چھوڑ دیں گے تو یہی ہوگا۔ وہ بس ٹوٹنے والی چیزوں کی فہرست بناتے رہیں گے!"

دلبر نے کہا، "اچھا میں تو چلا تاج پوشی کے جشن میں، دیکھوں جون بھائی اب کیا خبر لائے ہیں۔ مگر تم کدھر چلے، یقیناً تمھارا رُخ موکھی کے شیشہ خانے کی طرف ہوگا۔"

"کہاں یار!" ناصر بولا، "موکھی کا شیشہ خانہ تو کب کا تہس نہس ہو چکا اور جو شیشہ کش اور مے خوار تھے، وہ سب کے سب ذلیل و خوار ہوئے، کچھ جیل میں ہیں اور کچھ نشہ ہرن کرانے انسدادِ منشیات کے اسپتال میں۔ میں اس وقت ذرا لتا ڈیسائی کے اخبار کے دفتر جاؤں گا، بہت دنوں سے ملاقات نہیں ہوئی، پتا تو کروں کہ نوکری چھوٹنے کے بعد کیلاش رام چندانی معمار اور پیانو نواز کیا کر رہا ہے؟"



# ۳۲

## آتما ہتیا

لتا نے گاڑی چلاتے ہوئے ناصر سے پوچھا، "میں اتنے دنوں سے تمھاری تلاش میں تھی، فریدون خستہ تن کے گودام میں آگ لگنے اور اس کے فرار ہونے کے واقعے کے بعد میں پریشانی میں تمھارے پرانے گھر بھی گئی مگر پتا چلا کہ تم کسی اور جگہ منتقل ہو گئے ہو، کہیں شارجہ تو نہیں چلے گئے، کہاں رہتے ہو آج کل؟"

ناصر نے کہا، "ماتمی خبروں کے عجائب گھر میں۔"

"کیا؟" لتا حیران ہوئی، "یہ کیسا میوزیم ہے اور خبریں بھی ماتمی۔" پھر وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی اور بولی، "خیر آج کل تو ساری خبری ماتمی ہی ہوتی ہیں۔"

ناصر نے کہا، "میرا یہ دوست جس کا نام دلبر ہے تھوڑا سا خبطی ہے، اس نے اپنے گھر میں خبروں کا عجائب گھر کھول رکھا ہے جس میں صرف قزاقوں اور قاتلوں کے کارناموں کے بارے میں اخبارات کے تراشے جگہ پاتے ہیں، کہتا ہے آج کل بس وہی دنیا پر قابض ہیں باقی لوگ تو بس یہاں لٹنے اور جان دینے آئے ہیں۔"

لتا نے سر ہلایا، "بات تو وہ ٹھیک ہی کہتا ہے مگر اتنا قنوطی بھی نہیں ہونا چاہیے آدمی کو، کچھ لوگ دنیا میں ایسے بھی تو ہیں جو ان قاتلوں اور قزاقوں سے لڑ رہے ہیں۔"

ناصر ہنسا، ''تمھارا قزاق کہاں ہے آج کل؟''

''کیلاش؟'' لتا بولی، ''تمھیں پتا ہے اس کی نوکری جاتی رہی ہے۔''

''مجھے معلوم ہے۔'' ناصر نے جواب دیا، ''مگر وہ الف لیلہ تھیٹر میں پیانو بجانے بھی نہیں آ رہا ہے آج کل، مرجینا بتا رہی تھی۔''

لتا نے یکا یک اسٹار بکس کافی ہاؤس کے سامنے گاڑی روک لی، ''آؤ اندر بیٹھ کے باتیں کرتے ہیں — کافی اچھی ہو تو بری باتیں بھی اچھی لگنے لگتی ہیں۔''

ناصر نے لتا کے سامنے چمڑے کے کالے صوفے پر نشست سنبھالتے ہوئے کہا، ''کیلاش کے بارے میں اگر کوئی بات پوچھی جائے تو وہ تمھیں بری لگتی ہے کیا؟''

''نہیں یہ بات نہیں، کیلاش میرا بہترین دوست ہے، تم جانتے ہو مگر اس کے مطالبات بڑھتے جا رہے ہیں، میں نے اسے سمجھایا تھا مگر اس نے شاید اپنے کانوں کے ساتھ ساتھ دماغ کا دروازہ بھی پوری طرح بند کر رکھا ہے — مجھے تو لگتا ہے یہ گھر بھی ایسے بناتا ہوگا جس میں دروازے نہیں ہوتے ہوں گے۔''

''تم نے تو اس سے ملنا جلنا بالکل ہی چھوڑ دیا ہے، کچھ دن پہلے اس نے مجھ سے کہا تھا، وہ مجھے بڑا اداس اور پریشان نظر آیا۔''

''وہ اپنی نوکری کے خاتمے سے بھی پریشان ہے۔'' لتا نے کہا، ''اچھا اب تم اپنی سناؤ کیا کر رہے ہو؟'' اس نے موضوع بدل دیا۔

ناصر نے کہا، ''بری خبروں کے عجائب گھر میں رہتا ہوں اور اس دن کا انتظار کرتا ہوں جب حکومت عام معافی کا اعلان کرے تاکہ ہم جیسے لوگ جو یہاں غیرقانونی طور پر رہ رہے ہیں، باعزت واپسی کی راہ اختیار کرسکیں۔''

''تم واپس کیوں جانا چاہتے ہو؟'' لتا نے پوچھا، ''وہاں کے حالات — بھئی میں کچھ کہنا نہیں چاہتی، ورنہ تم فوراً یہ الزام لگاؤ گے کہ دشمن ملک سے تعلق ہے میرا — مگر میں تمھاری بھلائی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں، جو لوگ سارا وقت 'ٹارگٹ کلنگ' میں مصروف رہتے ہیں انھیں خوش ہونے کا کیوں موقع دینا چاہتے ہو؟''

''وہاں میری بیٹی بڑی ہوگئی ہے۔'' ناصر نے کہا۔



''اچھا —'' تجسس سے لتا کی آنکھیں چمک اٹھیں، ''تمھیں بہت پیار ہے اپنی بیٹی سے اور تم اسے دیکھنا چاہتے ہو۔ وہ بھی تم سے ملنا چاہتی ہوگی، تمھیں دیکھنا چاہتی ہوگی۔''

''بالکل —'' ناصر نے کہا، ''وہ مجھے جانتی ہے، پہچانتی نہیں کیوں کہ اس نے مجھے پچیس سال سے نہیں دیکھا۔''

اسی وقت موبائل کی گھنٹی بجی۔ لتا نے فون کانوں سے لگایا، ''ہیلو — جی سر!'' وہ بولی، ''ہاں میں ابھی شہر میں ہوں، گھر نہیں پہنچی۔''

''کیا — اچھا — کس علاقے میں؟'' اس نے نوٹ بک پر کچھ لکھنا شروع کیا۔ جمیرا میں — اوہ — کون سا ہوٹل — برج — اچھا میں سمجھ گئی — وہ سب سے اونچا والا نہیں — میں فوراً جاتی ہوں اور وہیں سے رپورٹ فائل کروں گی۔''

لتا نے فون بند کر کے پرس میں رکھا اور کہنے لگی، ''ایمرجنسی ہے — ایک آدمی نے ہوٹل کی چھت سے کود کے خودکشی کر لی ہے اور ایڈیٹر کا خیال ہے مجھے فوراً وہاں جانا چاہیے۔''

''مگر یہ تمھارا کام تو نہیں، کرائم رپورٹر کہاں ہے آج؟'' ناصر نے پوچھا۔

''چھٹی پر ہیں، لہٰذا یہ کام میرے سر پر!'' لتا نے کہا۔

''چلو میں تمھارے ساتھ چلتا ہوں۔'' ناصر بولا، ''اتنی رات میں تم اکیلی کیسے جاؤ گی؟''

لتا نے زیرِ زمین کار پارک سے گاڑی باہر نکالی اور پھر تیزی سے جمیرا کی طرف دوڑائی۔ سڑکیں روشن تھیں اور سڑک کے کنارے لگے ہوئے برقی اشتہار چمک رہے تھے۔ کئی پلوں اور سرنگوں سے گزر کے کچھ ہی دیر میں وہ جمیرا میں واقع اسی ہوٹل میں پہنچ گئے جو خودکشی کرنے والوں کا پسندیدہ تھا۔ ہوٹل کے باہر کئی پولیس گاڑیاں اور ایمبولینسیں جمع تھیں۔

لتا باہر نکلی۔ کئی اخباروں کے فوٹوگرافر اور ٹی وی چینلوں کے کیمرہ مین اپنی کارروائیوں میں مصروف تھے۔ لتا کے اخبار کا فوٹوگرافر آنند بھی وہاں موجود تھا۔ لتا نے اس سے پوچھا، ''کیا ہوا؟''

آنند نے کہا، ''ایک شخص نے ہوٹل کی چھت سے کود کے آتما ہتیا کر لی۔''

''کون شخص ہے وہ؟'' لتا نے سوال کیا۔ ایک پولیس افسر، جو خودکشی کرنے والے کی

لاش اٹھوا کے ایمبولنس میں رکھوا رہا تھا، پلٹ کے لتا سے بولا، ''اس کے تو ٹکڑے ہو گئے ہیں، بے چارہ کوئی آرکی ٹیکٹ تھا۔''

''کیا—؟'' لتا چونکی، ''کوئی شناختی کارڈ وغیرہ ملا اس کے پاس سے؟''

''ملا ہے۔'' پولیس افسر نے کہا، ''انڈین تھا، کیلاش نام تھا، کیلاش رام چندانی۔''

''اوہ گاڈ—!'' لتا کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور وہ ناصر کا سہارا لے کر زمین پر بیٹھ گئی۔

''اپنے آپ کو سنبھالو۔'' ناصر نے لتا کے کندھے پر ہاتھ رکھا، ''بہت برا ہوا۔''

لتا بری طرح کانپ رہی تھی۔

''مر کیوں گیا وہ—؟'' ناصر بولا، ''کم زور آدمی— نوکری چھوٹ جانے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ آدمی مر جائے— اور نوکری چھوٹے بھی تو کئی ہفتے ہو گئے تھے، اب ایسی نئی کیا بات ہوئی کہ...!''

لتا نے کہا، ''میں جانتی ہوں کیا ہوا— کل اس نے مجھے میرے میاں کے ساتھ سٹی سینٹر میں دیکھا تھا۔ مسٹر ڈیسائی کے ساتھ — وہ لندن سے اپنی ٹریننگ مکمل کر کے سال بھر بعد لوٹ آیا ہے نا۔'' لتا نے سر پر ہاتھ رکھا اور فٹ پاتھ کے منڈیر پر بیٹھ کے زار و قطار رونے لگی۔ ناصر بھی اس کے برابر میں فٹ پاتھ پر بیٹھ گیا اور اسے تسلیاں دینے لگا۔

''آدمی کا دماغ بھی عجب گورکھ دھندا ہوتا ہے یار۔'' اس نے کہا، ''اب کیلاش جیسا شخص بھی جو اتنا سمجھ دار تھا، نوکری چھوٹ جانے سے مایوسی کا شکار ہو کے آتما ہتیا کر لے تو عقل و فراست پر سے آدمی کا اعتبار اٹھ جاتا ہے۔''

''نہیں— کیلاش شاید اسی لیے پیدا ہوا تھا۔'' لتا نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا، ''اس نے تو شاید اسی دن آتما ہتیا کر لی تھی جب اس نے مجھ سے پیار کرنے کا خیال اپنے دل میں بسایا تھا— ایک بیاہتا عورت سے! بیوقوف آدمی!''



# ۳۳

# توپ تماشا

رمضان کے مہینے میں کھاڑی کے ساحل کے اس گوشے میں جہاں ایوانِ حکومت واقع ہے، توپ خانہ چوک پر بڑی سرگرمی نظر آتی ہے اور ہر شام سپاہی توپ داغ کے روایتی طریقے سے افطار کے وقت کا اعلان کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ صرف توپ بازی سے لطف اندوز ہونے دور دور سے وہاں آتے ہیں۔ ناصر کو یہ منظر اپنے گھر کی کھڑکی سے نظر آتا ہے کیوں کہ اس کا مکان پرانے محلے کے اس کونے میں واقع ہے جو سمندر کے عین سامنے ہے۔ عید کا چاند نظر آنے کا اعلان بھی بذریعۂ توپ کیا جاتا ہے مگر اس میں بڑی مشکلیں ہیں، بعض اوقات شہادتیں اتنی دیر سے ملتی ہیں کہ آدھی رات گزر جاتی ہے، اس لیے لوگ عید کا چاند نظر آنے یا نہ آنے کی اطلاع ٹیلی وژن پر سنتے ہیں۔ اس سلسلے میں حکومت کے اعلان کو بہت اہمیت دی جاتی ہے اور سرکاری چاند مستند سمجھا جاتا ہے، پھر بھی بہت سے لوگ اسے نہیں مانتے اور اپنا چاند اپنے گھر میں دیکھنا چاہتے ہیں اور دو عیدیں کرتے ہیں۔

دلبر پاکستانی کہتا ہے کہ رویتِ ہلال کا یہ تنازع ہر اس جگہ ملے گا جہاں جہاں مسلمان بستے ہیں۔ کوئی ملک اور کوئی مسلمانوں کی بستی ایسی نہیں ملتی جہاں لوگ بس ایک چاند پر اکتفا کر لیتے ہوں۔ آج بھی اس کا یہی مؤقف تھا۔

ناصر نے کہا، ''دو چندی عید کا چلن اب اس قدر عام ہوگیا ہے کہ ان ملکوں میں بھی جہاں رویتِ ہلال کی خاص کمیٹیاں قائم ہیں، ایک ہی شہر میں دو چاند نکلتے ہیں اور دو عیدیں ہوتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایک دوست دوسرے دوست کے گھر عید ملنے جاتا ہے تو وہاں سیویوں کے بجائے روزہ افطار کرنے کے لیے کھجوریں میسر آتی ہیں۔''

دلبر پاکستانی نے جواب دیا، ''یہاں بھی یہی صورتِ حال ہے اور میں ایسے بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو سرکاری عید نہیں مانتے اور ہمیشہ دوسرے دن عید کرنے پر مصر رہتے ہیں، چاہے حکومت کے کارندے زچ ہو کے دوسرے دن ان کے لیے عیدگاہ کا دروازہ مقفل کردیں۔''

ناصر نے کہا، ''امتِ مسلمہ کے اتحاد کی موجودہ صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہی امکان ہے کہ یہ سلسلہ قیامت تک ایسے ہی چلے گا۔''

دلبر پاکستانی نے مسکرا کے کہا، ''بہت سے اہلِ نظر تو روزِ محشر کا بھی ایسا ہی نقشہ کھینچتے ہیں۔ ان کے خیال میں جب قیامت آئے گی اور مُردے اپنی قبروں سے میدانِ حشر میں جانے کے لیے برآمد ہوں گے تو انھیں اپنے بہت سے ساتھی اپنی قبروں میں آرام سے لیٹے اخبار پڑھتے ملیں گے۔''

''ارے— اٹھو اٹھو، قیامت آگئی ہے۔ ان سے کہا جائے گا مگر وہ ہنس کے جواب دیں گے، آپ چلیں، ہماری قیامت تو کل ہے۔''

خیر، اتفاق یہ ہوا کہ اب کی بار جو عید آئی تو کم از کم ناصر اور دلبر پاکستانی کے درمیان ایک دن اور ایک ہی مسجد میں نماز پڑھنے پر اتفاق ہوگیا۔ نماز کے بعد دونوں نے اس بات پر بھی اتفاق کیا کہ گھر جا کے سو جائیں گے— اور یہی ہوا— وہ مزید سوتے رہتے اگر نائر ان کے لیے مٹھائی، سیویاں، مرغ قورمہ اور ٹوکرا بھر ملباری پراٹھے نہ لے آتا۔ پھر بہت سے مہمان بھی آدھمکے جن میں لتا اور الف لیلہ تھیٹر کے بہت سے اداکار بھی شامل تھے مگر مرجینا نہیں آسکی کیوں کہ وہ اس دن القرقاوی کے یہاں خصوصی ضیافت پر مدعو تھی جسے اس نے 'عیدملن' کا نام دیا تھا۔



کھانا کھاتے ہوئے لتا نے ناصر سے کہا، ''ایک خوش خبری ہے تمھارے لیے۔''

''وہ کیا—؟'' ناصر بولا، ''جلدی بتاؤ۔''

لتا نے کہا، ''حکومت نے عید کے موقع پر جہاں قیدیوں کی سزائیں معاف کردی ہیں، وہاں غیرقانونی تارکینِ وطن کے لیے بھی عام معافی کا اعلان کیا ہے۔ ان لوگوں کا بھلا ہوجائے گا جو پاسپورٹ اور ویزا کے بغیر یہاں رہ رہے ہیں— وہ اب اپنے اپنے سفارت خانوں سے قانونی دستاویزات حاصل کرسکیں گے، بغیر کسی پریشانی کے۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' ناصر خوش ہو کے بولا، ''میرا بن باس بھی ختم ہوسکے گا اب، مگر کاغذات کا حصول اتنا آسان نہیں۔''

دلبر پاکستانی نے کہا، ''فکر مت کرو، تمھاری مشکلات کا حل میرے پاس ہے، سفارت خانے میں میرا ایک دوست ہے، وہ تمھارے سب کام کرا دے گا، تمھیں اِدھر اُدھر دھکے کھانے کی ضرورت نہیں۔''

نائر نے کہا، ''واہ کیا بات ہے— یہ سفارت خانے والے چاہے کہیں کے بھی ہوں، عام لوگوں کو بہت دوڑاتے ہیں، دیکھنا اب پاکستانی، ہندوستانی اور بنگلہ دیشی سفارت خانوں کے باہر کیسی خوف ناک قطاریں لوگوں کی دیکھنے میں آئیں گی۔''

لتا نے کہا، ''اور واپس جانے والے ہوائی کمپنیوں پر اپنی نشستوں کے لیے دھاوا بول دیں گے، ان میں ایسے بھی ہوں گے جو سماجی تنظیموں اور خیراتی انجمنوں سے مفت ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے چھینا جھپٹی کریں گے۔''

نائر نے کہا، ''خیر، میں ابھی کچھ دن اور یہاں رہنا چاہتا ہوں، ورنہ اس موقعے پر میں بھی مفت ٹکٹ حاصل کرنے کے لیے کوئی تکڑم لڑاتا۔''

لتا نے کہا، ''یہ پہلی بار ہے کہ زندوں کو مفت ٹکٹ دیے جا رہے ہیں۔ ورنہ روایت کے مطابق اب تک ہوائی کمپنیاں صرف دیارِ غیر میں مرنے والوں کے تابوت ہی بلامعاوضہ وطن بھیجنے پر راضی ہوتی تھیں۔''

''شاید یہی وجہ ہے کہ زیادہ تر تارکینِ وطن مرنے سے پہلے گھر واپس نہیں لوٹنا

چاہتے۔'' دلبر پاکستانی ہنسا۔

لتا نے کہا، ''ناصر تمھارے لیے یہ موقع بہترین ہے...''

''زندہ لوٹنے کا—'' دلبر پاکستانی نے ہنس کے لتا کا فقرہ مکمل کیا، ''موقعے سے فائدہ اٹھاؤ یار۔''

ناصر مسکرایا اور پھر اداس ہوگیا۔

لتا بولی، ''پتا نہیں کب سے وہاں کتنی آنکھیں تمھاری راہ دیکھتی ہوں گی۔''

ناصر نے ہولے سے کہا، ''وہ میری بیٹی کی آنکھیں ہیں جو کب سے میرے انتظار میں ہیں۔''

لتا نے کہا، ''شاید کچھ ہی دنوں میں ہم لوگ بھی چلے جائیں— میرا شوہر مجھے ساتھ لے کر ممبئ واپس جانا چاہتا ہے جہاں وہ اپنی ایڈورٹائزنگ کمپنی کھول رہا ہے۔''

''ہاں، کیلاش کا کیا بنا؟'' ناصر نے پوچھا، ''اس کی آخری رسومات کہاں ادا کی گئیں؟''

''یہیں سوناپور کے مرگھٹ پر۔'' لتا نے کہا، ''اس کا وہاں اپنے ملک میں کوئی تھا ہی نہیں۔''

جب سب چلے گئے تو دلبر پاکستانی نے کہا، ''کچھ دنوں سے میری بائیں آنکھ پھڑک رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ پتا نہیں کون سی بری خبر سننے کو ملے گی، پہلے تو یہ اطلاع ملی کہ قرۃ العین حیدر وفات پا گئی ہیں اور اب تمھارے جانے کی خبر آئی۔''

ناصر نے کہا، ''میرا جانا تو خیر برا نہیں ہے، کب سے میں اس موقعے کے انتظار میں تھا، البتہ عینی آپا کی وفات سے اردو دنیا ضرور ویران ہوگئی ہے، مجھے پتا تھا کہ تم بھی اُن کے پرستار ہو۔'' دلبر پاکستانی نے کہا، ''میں اُن کی ساری کتابیں گھوٹ کے پی چکا ہوں، رہ گئے تم، تو تم سے مجھے بڑی ڈھارس سی تھی۔ تم بری خبروں کے میوزیم میں زندہ رہنے کے لیے میرا حوصلہ بڑھاتے رہتے تھے، تم سے مل کے مجھے یہ بھی اطمینان ہوا تھا کہ ابھی کچھ لوگ ادب وَدب سے بھی دل چسپی رکھتے ہیں، ورنہ صورتِ حال اتنی خراب ہوچکی ہے کہ اب کسی نوجوان سے پوچھو کہ قرۃ العین حیدر کون ہیں تو جواباً وہ یہ سوال کرے گا کہ کس چینل پر آتی



ہیں؟ ہماری نئی نسل عینی آپا کو کہاں جانے گی۔ وہ بس ٹی وی پر کھانا پکانے والی آپاؤں کو پہچانتی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے۔'' ناصر بولا، ''مگر تم نے ان میں ایسا کیا پایا کہ بھول ہی نہیں سکتے، اہلِ دانش تو یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے جو کچھ لکھا، اس میں ماضی کا حال زیادہ ہے، حال کا حال کم ہے، کیوں کہ حال کا حال وہ اس وقت تک نہیں لکھتی تھیں جب تک کہ وہ ماضی میں نہ بدل جائے۔ تاریخ سے اُن کی محبت کا یہ عالم تھا۔''

دلبر پاکستانی کی جبینِ روشن پر ناگواری کی شکنیں نمودار ہوئیں، ''مجھے تو اُن کی تاریخ میں اپنا جغرافیہ نظر آتا ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کا کمال یہ ہے کہ ہم اُن سے نہ صرف حال کی گتھیاں سلجھا سکتے ہیں بلکہ اپنے مستقبل کے بارے میں بھی پیش گوئیاں کرسکتے ہیں۔''

ناصر نے ہنس کے کہا، ''کمال ہے، اب تک لوگوں کو حافظ کے دیوان اور اقبال کے کلام سے تو فال نکالتے سنا تھا مگر قرۃ العین حیدر کی کتابوں سے بھی یہ کام لیا جاسکتا ہے، مجھے نہیں معلوم تھا۔''

دلبر پاکستانی نے کہا، ''جناب کتابوں کا متن جانے دیجیے، اُن کے عنوانات اس درجے گمبھیر ہیں کہ ان سے آپ ملکی حالات جان سکتے ہیں۔''

ناصر نے جیسے امتحان لینے کی خاطر پوچھا، ''اچھا تو بتائیے وطنِ عزیز میں جمہوریت کی جدوجہد کو کیا نام دیا جائے؟''

کہا، ''آگ کا دریا۔''

ناصر نے سوال کیا، ''اور ملک میں قانون کی حکمرانی اور بدعنوانی کے خاتمے کے لیے آپ سیاسی جماعتوں کے اتحاد کو کیا کہیں گے؟''

دلبر نے جواب دیا، ''شیشے کے گھر۔''

ناصر نے پھر سوال داغا، ''آخر بدعنوان سیاست دان اور لٹیرے حکمران کب ریٹائر ہوں گے اور اپنے گھروں کو لوٹیں گے؟''

دلبر نے کہا، ''کارِ جہاں دراز ہے۔''

ناصر نے پوچھا، ''اور بے چارے عام لوگ جیسی پریشان حال زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اور جن مصیبتوں میں مبتلا ہیں، اس کیفیت کو کیا کہا جائے؟''

دلبر نے جواب دیا، ''سفینۂ غمِ دل — جس کے بارے میں کچھ پتا نہیں، کب اسے ساحل دیکھنا نصیب ہوگا۔''

ناصر نے کہا، ''تمھارے بیان کے مطابق اگر عینی آپا کی تحریریں ہماری ساری سماجی صورتِ حال کی ترجمانی کرتی ہیں تو تمھارے بری خبروں کے میوزیم کی سیر کے دوران جو کچھ سنائی دیتا ہے، اسے ان کے لفظوں میں کیا کہیں گے؟''

دلبر نے کہا، ''پت جھڑ کی آواز!''



# ۳۴

## محمد خمیس پیدل

دلبر پاکستانی صبح سے ان فرائض کی تکمیل کے لیے غسل خانے میں بند تھا جو حوائجِ ضروری میں شمار ہوتے ہیں اور کمرے میں دیر سے 'آفرین آفرین' کی صدائیں گونج رہی تھیں۔ ناصر کو صبح سویرے جب بھی نصرت فتح علی خان یہ راگ الاپتے سنائی دیتے، وہ سمجھ جاتا کہ دلبر کہاں ہے۔ غسل خانے سے باہر آتے ہی وہ نصرت فتح علی خان کو چھٹی دے کر اُن کی جگہ ٹیپ ریکارڈر پر ملکۂ ترنم نور جہاں کو نغمہ سرائی کا موقع دیتا اور وہ فوراً ہی دشتِ تنہائی میں جانِ جہاں کو پکار کے کمرے میں اس کی آواز کے سایوں اور ہونٹوں کے سرابوں کے رنگ بکھیرنے لگتیں۔ یہ روز کا معمول تھا۔ لہٰذا آج جب غسل خانے سے باہر آ کے دلبر نے نصرت فتح علی خان کو صبح کی ڈیوٹی سے چھٹی دی تو ناصر نے کہا، ''مجھے پتا نہیں تھا کہ استاد کی آواز میں نظامِ انہضام کو مؤثر بنانے کی تاثیر بھی ہے۔ آفرین آفرین!''

دلبر ہنسا، ''موسیقی اور خاص طور پر اچھی موسیقی اس عمل کے دوران بھی جسے یوگا کا ہی ایک آسن سمجھنا چاہیے، خیالات کو یکسوئی بخشتی ہے مثلاً آج ہی غور و فکر کرتے ہوئے مجھے دو نہایت اہم کام یاد آئے جنھیں میں کب سے ٹال رہا تھا۔''

ناصر نے پوچھا، ''اور وہ دونوں اہم کام کون سے ہیں؟''

دلبر نے کہا، ''سب سے پہلے تو مجھے ایک بینک ڈرافٹ بنوانا ہے پاکستان بھیجنے کے لیے اور دوسرے ایک پرانے دوست سے ملنا ہے بلکہ تمھیں بھی ملوانا ہے، لہٰذا ناشتا کرو اور بس نکل کھڑے ہو۔''

گھر کے قریب ہی ایک مشہور بینک تھا۔ دلبر اندر جانے لگا تو ناصر نے کہا، ''تم بینک ڈرافٹ بنواؤ، اتنی دیر میں، میں سامنے والی کتابوں کی دکان سے اخبار لے کر آتا ہوں۔''

ناصر اخبار خرید کے واپس آیا تو دلبر بینک کے باہر اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''ارے —'' ناصر نے کہا، ''اتنی جلدی فارغ ہو گئے — میں تو سمجھا تھا کہ بینک میں دیر لگے گی۔''

''اصل میں مجھے ہر مہینے بینک ڈرافٹ بنوانا پڑتا ہے، اس لیے سارے کوائف کمپیوٹر میں محفوظ ہیں، اس کا فائدہ یہ ہے کہ اِدھر بینک افسر نے بٹن دبایا اُدھر بینک ڈرافٹ تیار — ذرا دیر نہیں لگتی۔'' دلبر نے کہا۔ پھر اس نے ٹیکسی روکی جس پر 'اجرہ' کا نشان روشن تھا۔ ٹیکسی میں بیٹھ کے دلبر نے ڈرائیور کو ایک اسپتال کا پتا بتایا۔

''کوئی شخص اسپتال میں داخل ہے کیا، کوئی بیمار ہے یا کسی حادثے کا شکار ہوا ہے؟'' ناصر نے پوچھا، ''بے چارہ بیمار بھی ہے اور حادثے کا بھی شکار ہوا ہے۔'' دلبر نے کہا۔

اسپتال کے دروازے پر اتر کے دلبر نے پھولوں کی دکان سے ایک گل دستہ خریدا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ متعلقہ وارڈ چوتھے فلور پر تھا۔ پورے ہال میں بڈھے ہی بڈھے تھے، ہر قماش اور ہر شکل کے بڈھے جو اپنے اپنے بستروں پر آرام کر رہے تھے۔

''یہ کس قسم کا وارڈ ہے یار —؟'' ناصر نے پوچھا، ''یہاں کم عمر مریضوں کا داخلہ منع ہے کیا؟''

''یہ 'بڈھا گھر' ہے بھئی!'' دلبر نے جواب دیا، ''اور ہم لوگ جس آدمی سے ملنے آئے ہیں، وہ بڈھا ہے اور بیمار بھی۔''

چند قدم آگے بڑھتے ہی دلبر دائیں ہاتھ پر دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ایک بستر کی طرف لپکا، ''صباح الخیر۔'' اس نے بستر پر لیٹے ہوئے ایک بڈھے کو سلام کیا جس نے بایاں



ہاتھ ذرا سا اوپر اٹھا کے سلام کا جواب دیا اور اس کا دایاں ہاتھ کٹی ہوئی شاخ کی طرح بے حس و حرکت پڑا رہا۔ بدن کا وہ حصہ بھی بالکل منجمد تھا۔

دلبر نے اس کا بایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر سہلایا اور بولا، ''آپ خوش تو ہیں نا؟ حالات پہلے سے کچھ بہتر ہوئے؟''

بڈھے نے کچھ کہنے کی کوشش کی مگر زبان سے لفظ ادا ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ پھوٹ گئے۔

''بچہ لوگ تو آتا ہے نا، آپ سے ملنے؟'' دلبر نے سوال کیا مگر بڈھے کے چہرے پر محض ملال کے بادل چھائے رہے۔

دلبر نے اس کا ہاتھ پکڑ کے اپنے سینے سے لگایا اور بولا، ''اللہ مدد کرے گا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ پھر سے اپنے پاؤں پر چلنے لگیں گے اور ہم دونوں پہلے کی طرح پھر سے سڑکوں پر پیدل گھومتے پھریں گے، ٹھیک ہے نا، محمد خمیس پیدل۔''

بڈھا منہ ٹیڑھا کر کے ذرا سا مسکرایا اور پھر سے سنجیدہ ہو گیا۔

اب دلبر، ناصر کی طرف مڑا، ''ناصر یہ ہیں میرے بزرگ دوست جن کے ساتھ میں نے شہر کے چپے چپے کو پیدل گھوم کے دیکھا ہے، ہم خوب پیدل چلتے تھے اور شہر کی سیر کرتے تھے۔ جب سے یہ بیمار ہوئے ہیں، میں نے پیدل چلنا ہی چھوڑ دیا ہے۔''

دونوں کچھ دیر محمد خمیس کے پاس بیٹھے رہے، پھر اجازت لے کر اُٹھ گئے۔

باہر نکل کے دلبر نے کہا، ''تو یہ تھے محمد خمیس پیدل، ان کا نام تو محمد خمیس ہے مگر انھوں نے پیدل چلنے کا عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔ پیدل چلنا پہلے ان کا شوق تھا مگر بعد میں ان کا مشغلہ، ان کا کاروبار اور ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ سال میں کئی بار وہ پورے ملک کا پیدل چکر لگا کے انسانی بھلائی کے مختلف مقاصد کے لیے مالی عطیات جمع کرتے تھے۔ کبھی پتا چلتا کہ وہ افریقا کے فاقہ کش بچوں کو خوراک فراہم کرنے کے لیے یونیسیف کے ساتھ مل کے عطیات جمع کر رہے ہیں، کبھی معلوم ہوتا کہ وہ ایران، ترکی یا ہندوستان میں زلزلے یا سیلاب کی آفت کا شکار ہونے والوں کے لیے امدادی مہم کا حصہ ہیں تو کبھی انھیں سرطان کے

مریضوں کے علاج کے لیے کسی اور ملک میں اسپتال کی تعمیر کے لیے عطیات جمع کرتے پایا جاتا۔ ان کے پیدل چلنے کے جنون کی وجہ سے ان کا نام ہی محمد خمیس پیدل پڑ گیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ وہ پیدل ہی پیدا بھی ہوئے تھے کیوں کہ ان کی والدہ نے بتایا تھا کہ وہ اس دنیا میں سر کے بل نہیں پاؤں پر چل کے تشریف لائے۔''

ناصر نے پوچھا، ''مگر تمھاری ان سے کہاں ملاقات ہوئی؟''

''یہ بھی عجیب کہانی ہے۔'' دلبر بولا، ''بہت دن ہوئے میں ایک بس اسٹاپ پر کھڑا تھا، بس کے انتظار میں اور بس تھی کہ آ ہی نہیں رہی تھی کہ اچانک کہیں سے موصوف چہل قدمی کرتے ہوئے نمودار ہوئے۔ وہ میرے پاس لمحے بھر کو رُکے اور بولے، ''بس اگر بس میں نہیں تو اپنے پاؤں استعمال کرو!''

''بس اس دن سے میں نے بھی ان کے ساتھ پیدل چلنا شروع کر دیا۔'' دلبر نے کہا، ''مگر یقین کرو میں نے اس شہر کو صحیح معنوں میں اپنی آنکھوں سے نہیں، اپنے پاؤں سے دیکھا۔ میں اسکول سے واپسی پر روز محمد خمیس کی طرف چلا جاتا جو سطوا کے پرانے مکانوں کے پیچھے ایک خستہ حال گھر میں رہتے تھے۔ ہم دونوں روز گھومنے نکل کھڑے ہوتے اور بندرگاہ کے سامنے سے گزر کے عقاب چورنگی کو پار کرتے ہوئے بردبئی کے ڈھک بازار میں چلے جاتے اور پھر عبرے سے کھاڑی عبور کر کے ڈیرہ میں نائف روڈ اور قادر ہوٹل کے اردگرد کی دکانوں کی سیر کرتے پھرتے۔''

ناصر نے کہا، ''یہاں کی چربی خور گرمی میں اتنا پیدل چلنا صحت کے لیے تو یقیناً بہت مفید ہوگا۔ مگر میرے بھائی تمھارے پاؤں پر کیا گزری، اب بھی آپ کے وہی پیر ہیں یا کہیں سے نئے لگوائے ہیں؟''

دلبر ہنسا، ''اب سے کچھ سال پہلے تک جب شیخ زید روڈ پر شیشے کے گھروں کی بھیڑ بھاڑ تھی، نہ ستونوں پر کھڑے ریل کے جناتی پُل، رمضان کی راتوں میں یہاں ریت کے ٹھنڈے سرمئی قالینوں پر میلوں چلتے رہنا اچھا لگتا تھا۔ اس کے پیچھے کا پورا میدان خالی تھا اور اس پر لگے ہوئے چوبی ستون جن کے اوپر چوکور سجاوٹی فریم لگے ہوئے تھے، ایک شاہی



شادی کی یاد دلاتے تھے جو برسوں پہلے وہاں ہوئی تھی۔ وہاں سے پیدل گزرتے ہوئے ان چوبی ستونوں کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ ایلس کے نام فیض کے خطوط کے مجموعے 'صلیبیں مرے دریچے میں' کی یاد آتی۔''

''اب تو وہاں سڑکیں اور سرنگیں بن گئی ہیں اور صلیبوں پر پھول اُگ آئے ہیں کیوں کہ وہاں ایک پارک بھی بن گیا ہے۔'' ناصر نے کہا۔

''ہاں مگر ایک زمانہ تھا جب اس سڑک کے کنارے راتوں میں ریت کے ٹیلے ایسے لگتے تھے جیسے سیکڑوں بڑے کوہان والے اونٹ ایک قطار میں بیٹھے ریگستان کی ٹھنڈی ریت کا مزہ لے رہے ہوں اور محمد خمیس کو بھی یہ ریت کے ٹیلے اتنے پسند تھے کہ اس کی رمضان کی شامیں عموماً یہیں گزرتی تھیں، وہ اپنے کئی دوستوں کو بھی ساتھ لے آتا، پھر ہم رات گئے تک وہاں بیٹھے موج مستی کرتے رہتے اور قہوے اور شیشے کے دور چلتے رہتے۔''

ناصر نے کہا، ''محمد خمیس ریگستان کا سچا عاشق تھا، اسی لیے شاید وہ اپنے پاؤں کبھی صحرائی مٹی سے جدا نہیں ہونے دیتا تھا۔''

''محمد خمیس کا کہنا تھا کہ پیدل چلنے سے آدمی فطرت کے نزدیک رہتا ہے اور پاؤں کی رگڑ سے اسے زمین کی تہوں میں چھپی قدرتی توانائی حاصل ہوتی ہے——'' دلبر بولا، ''مگر پھر کچھ یوں ہوا کہ اچانک اس نے پیدل چلنا چھوڑ دیا—— اور رفتہ رفتہ اس کی صحت خراب ہونے لگی۔''

''وہ کیسے؟'' ناصر نے پوچھا۔

دلبر نے کہا کہ جب شیخ زید روڈ پر شیشے کے گھر بننا شروع ہوئے اور ریت کے اونٹ اپنے بھورے کوہانوں سمیت وہاں سے کوچ کرنے لگے تو محمد خمیس پریشان ہو گیا۔ اصل میں وہ بچپن سے اونٹوں کے ساتھ رہتا آیا تھا اور شہر آنے سے پہلے صحرائی بستی میں اس کے پاس تین اونٹ تھے، ایک اونٹ اور دو اونٹنیاں—— اونٹ اس کی آمدنی کا ذریعہ تھے اور اونٹنی کا دودھ گھر میں استعمال ہوتا تھا۔''

ناصر نے کہا، ''میں نے بھی پیا ہے اونٹنی کا دودھ، بڑا مزے کا ہوتا ہے۔''

دلبر نے کہا، ''مزے کا بھی ہوتا ہے اور بڑا مفید بھی، کہتے ہیں ماں کے دودھ کے بعد اگر کوئی اور دودھ بچے کے لیے صحت بخش ہے تو وہ اونٹنی کا ہے، گائے کے دودھ کے مقابلے میں اس میں زیادہ غذائیت ہوتی ہے، پھر چکنائی بھی کم اور بہت ساری بیماریوں سے محفوظ رکھنے کی صلاحیت بھی۔ محمد خمیس شہر میں اونٹنی کے دودھ کا کاروبار شروع کرنا چاہتا تھا مگر اس کے بچے اس کام کے لیے تیار نہیں تھے، وہ شہر میں ٹیکسی چلانا چاہتے تھے، تب محمد خمیس نے انھیں ان کے حال پر چھوڑا اور خود پیدل چلنے لگا۔''

''مگر پھر اس نے پیدل چلنا چھوڑ کیوں دیا؟'' ناصر نے سوال کیا۔

''ایک دن وہ بولا، میں گھر جاتا ہوں تو مجھے میرے بچے وہاں نہیں ملتے، ان کی دل چسپیاں اور ہو گئی ہیں، وہ پیدل نہیں چلنا چاہتے، وہ چمچماتی ہوئی نئی نئی گاڑیوں میں گھومنا چاہتے ہیں۔ اس کے کچھ دنوں بعد محمد خمیس نے پیدل چلنا بالکل ترک کر دیا۔'' دلبر نے افسوس سے کہا، ''ایک دن میں نے اسے پھر اُکسایا کہ چلو لمبی سیر کو چلتے ہیں مگر وہ اداسی سے بولا، ''اب شہر میں پیدل چلنے کی جگہ باقی نہیں رہی، شیشے کے گھروں اور تیز رفتار گاڑیوں نے سب راستے بند کر دیے ہیں۔ جس دن میری اس سے یہ گفتگو ہوئی، اس کے چند دنوں کے بعد مجھے خبر ملی کہ اس پر فالج گرا ہے جس میں اس کا آدھا دھڑ بے کار ہو گیا ہے۔''

ناصر نے کہا، ''اور اب وہ سرکاری اسپتال کے اس وارڈ میں داخل ہے جس میں سب بڈھے رہتے ہیں۔''

دلبر نے کہا، ''جب سے اس کے بچے شیشے کے گھروں میں منتقل ہوئے ہیں، وہ اس سے ملنے بھی نہیں آتے کیوں کہ انھیں یہاں اپنی لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی کرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ اور محمد خمیس کے علاج کے لیے میلوں پیدل سفر طے کر کے عطیات اکٹھا کرنے والا بھی کوئی دوسرا نہیں۔''

ناصر کے جی میں آیا کہ وہ فوراً گھر جا کے ٹیپ ریکارڈ پر نصرت فتح علی خان کا وہی گیت بلند آواز میں لگا دے — آفرین آفرین —''



# ۳۵

# کھوئے ہوئے شہر

مرجینا، الف لیلہ تھیٹر سے شام کے پہلے شو سے فارغ ہونے کے بعد باہر نکل رہی تھی کہ اسے کینٹین کے باہر احمد القرقاوی نظر آیا۔ وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

''مرحبا!'' القرقاوی بولا، ''آج ہم لوگ ایک ساتھ ڈنر کریں گے، جبل علی ہوٹل کے سی فوڈ ریستوراں میں، راستہ لمبا ہے مگر چاندنی رات ہے، اس لیے مزہ رہے گا — ڈرائیونگ کا بھی اور ماہی خوری کا بھی۔''

مرجینا نے کہا، ''تم نے پہلے سے بتایا ہی نہیں ورنہ میں بھی کچھ ڈھنگ کے کپڑے پہن لیتی — مجھے تو گھر جانے کا بھی موقع نہیں ملا — ابھی ابھی چوروں کو جہنم واصل کر کے فارغ ہوئی ہوں۔''

القرقاوی ہنسا، ''چوروں سے نمٹ چکیں، اب ایک قزاق تمھارے حوالے — سمندر سامنے ہوگا، تم چاند کی قسم کھا کے اسے بھی ٹھکانے لگانے کا ارادہ کرو۔'' پھر وہ ذرا اور رومانٹک اداکاری کر کے بولا، ''آہ! کیسی دل فریب موت ہوگی وہ بھی جو مجھے تمھارے ہاتھوں نصیب ہوگی۔''

مرجینا بھی ہنسی، ''میرا موڈ تو نہیں تھا مگر اصرار ہے تو چلو آج کی شام ایک قزاق کے

نام سہی— مجھے یاد آیا کہ ایک ضروری بات بھی کرنی تھی تم سے۔"

"ضرور کرنا مگر اس وقت کوئی بات نہیں ہوسکتی، بات چیت کے لیے مناسب ماحول کا انتظام میں نے کھانے کی میز پر کیا ہے، نقرئی شمع دانوں کے ساتھ۔" اس نے نیچے اتر کے پورچ میں کھڑی اپنی سرخ رنگ کی پورش کار کا دروازہ کھولا۔

انھیں ساحلی سڑک پر مزے مزے سے چاند کے ساتھ ساتھ سفر کرتے ہوئے ہوٹل پہنچنے میں چالیس منٹ لگے۔ ہوٹل کے ساحلی سبزہ زار پر واقع ریستوراں میں ان کے لیے خصوصی میز لگائی گئی تھی، چاندی کے شمع دان میں سرخ شمعیں روشن تھیں۔ القرقاوی نے مرجینا کا ایک ہاتھ تھام کے بڑی ادا سے اسے اپنے سامنے والی کرسی پر بٹھایا اور کہا، "پتا ہے میں اس وقت کیا سوچ رہا ہوں؟"

"کیا سوچ رہے ہو؟" مرجینا نے پوچھا۔

"میں سوچ رہا ہوں کہ تم اتنی خوب صورت اور تر و تازہ لگ رہی ہو کہ محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ابھی سامنے پھیلے ہوئے سمندر سے نمودار ہوئی ہو، یونانی حسن کی دیوی افرودایتی کی طرح۔" اس نے کہا۔

"اچھا!" مرجینا کھلکھلا کے ہنسی، "اگر میں اس وقت اچانک اس بڈھی کھوسٹ یونانی دیوی کے جون میں آجاؤں جو ہزاروں سال پہلے قبرص کے سمندر سے نکلی تھی تو تمھارا کیا حال ہوگا— بھئی وہ تو بڑی خوف ناک بڑھیا بن چکی ہوگی اب تو— رعشہ زدہ، مکمل طور پر بہری اور پوپلے منہ والی— ڈر کے بھاگو گے تو نہیں؟"

"لاحول ولا قوۃ—" القرقاوی کا سارا رومان رخصت ہوگیا، "تم نے تو سارا مزہ کرکرا کردیا۔" وہ بولا، "بھئی ہم یہاں پیاری پیاری باتیں کرنے آئے ہیں— تم پتا نہیں کس چڑیل کا ذکر لے بیٹھیں۔"

"وہ اس لیے کہ تم نے مجھے یہ کہنے کا موقع نہیں دیا کہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔" مرجینا بولی۔

"اچھا کیا سوچ رہی ہو، بتاؤ!" القرقاوی نے ہتھیار ڈال دیے۔



اچانک بیروں نے میز پر پلیٹیں سجانا شروع کردیں— کچھ مشروبات آئے، پھر دیگر چیزیں آنا شروع ہوئیں— چھنچھناتی، دھواں چھوڑتی ٹرے میں مچھلیوں کے تلے ہوئے قتلے اور جھینگے—

القرقاوی نے اپنے آگے رکھے گلاس میں سے سرخ نیپکن باہر نکالا اور اپنے سامنے بچھایا، "تو کیا سوچ رہی تھیں تم؟" اب اس نے ذرا سنجیدگی سے مرجینا سے پوچھا۔

"پہلے تم بتاؤ!" مرجینا نے کہا، "تمھارے پاس بھی کہنے کو بہت کچھ ہے۔" اس نے چھری کانٹے سنبھالے۔

"میں—" القرقاوی بولا، "میں تو تمھیں یہ بتانے آیا تھا کہ میں نے بابا اور ماما سے بات کرلی ہے، ہم دونوں کی شادی کے بارے میں— بلکہ سب کچھ طے کرلیا ہے— بابا نے کہا ہے کہ شادی کی تقریب دنیا کی سب سے اونچی عمارت کے اس ہوٹل میں ہوگی جو اس کی ایک سو پینتیس ویں منزل پر واقع ہے، انھوں نے تجویز دی ہے کہ شادی عین اس دن کی جائے جب یہاں سالانہ جشنِ دبئی شروع ہو اور کھاڑی کے اردگرد آتش بازی کے مظاہرے کے دوران آگ کے پھول صحرائی آسمان پر ہمارے پیار کی داستان تحریر کریں— اس دن لگے گا کہ پورا شہر ہماری شادی کے جشن میں شریک ہے۔"

مرجینا نے سامنے رکھی مچھلی کے دو ٹکڑے کردیے۔ "آج تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ مچھلیاں بار بار جال میں کیسے پھنس جاتی ہیں— شاید پکڑنے والوں کی مہارت کی داد دینی چاہیے۔" وہ بولی۔

القرقاوی نے جھینگے کا گرما گرم پکوڑا اٹھا کے منہ میں رکھا اور سوچنے لگا، شاید مرجینا یہ سوچ رہی ہے کہ اسے جیولری کتنی ملے گی اور شادی کا جوڑا کس ڈیزائنر بوتیک سے— اس نے فوراً ہی کہا، "سنو، بابا نے کہا ہے کہ تمھیں تمھاری مرضی کے مطابق ساری چیزیں دی جائیں، جیولری اور شادی کے جوڑے کے لیے تم بلا تکلف مجھے اپنی پسند بتا سکتی ہو۔ ویسے بھی روایت کے مطابق سارا خرچ ہمارے ہی ذمے ہوگا، اس بارے میں تمھیں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔"

مرجینا کو یہ سن کے اتنا غصہ آیا کہ اس نے مچھلی کا وہ ٹکڑا جس میں اس کی آنکھ 'چشمِ عبرت' کی مثال بنی ہوئی تھی، کانٹے سے اٹھایا اور پورے کا پورا نگل لیا۔

''میں تو یہ نہیں سوچ رہی تھی —!'' اس نے خفا ہو کے کہا۔

''پھر — پھر کیا سوچ رہی تھیں تم؟'' القرقاوی نے پوچھا، ''اگر ہنی مون کے بارے میں سوچ رہی تھیں تو میں یہ بتانا چاہوں گا کہ شادی کے فوراً بعد ہم لوگ ہنی مون منانے جنوبی افریقا میں آفتاب نگر یعنی سن سٹی جائیں گے جہاں 'کھوئے ہوئے شہر' کو ہفتے بھر کے لیے دریافت کریں گے، کیا خیال ہے تمھارا، جنیوا اور روم وغیرہ تو پامال ہو چکے۔''

مرجینا نے کہا، ''نہیں میں یہ بھی نہیں سوچ رہی تھی، اصل میں میرا خیال تھا کہ کیوں نہ شادی سے پہلے میں ایک چکر فلسطین کا لگا آؤں، تمھیں پتا نہیں، ان دنوں وہاں کیسی آفت آئی ہوئی ہے، غزہ میں اسرائیلیوں کی ناکہ بندی کی وجہ سے لوگوں کو کھانا تک میسر نہیں ہے۔''

''کیا —؟'' القرقاوی کو لگا جیسے جھینگے کے بجائے کسی نے خود اسے اٹھا کے تیل کی کڑھائی میں جھونک دیا ہو۔ ''تم ان دنوں فلسطین جاؤ گی، جہاں موت گلیوں میں جھاڑو دیتی پھر رہی ہے — غضب خدا کا، ذرا ہوش کے ناخن لو۔'' وہ بگڑ کے بولا۔

''تم 'کھوئے ہوئے شہر' میں جانا چاہتے ہو نا —؟'' مرجینا نے کہا، ''فلسطینیوں کے سب شہر کھوئے ہوئے ہیں — اور وہ اپنے کھوئے ہوئے شہروں کو پھر سے ڈھونڈ نکالنا چاہتے ہیں — چلو وہاں چلتے ہیں۔''

القرقاوی نے مایوسی سے مرجینا کو دیکھا اور سرد لہجے میں بولا، ''کہیں تم اپنے کسی ڈرامے کے ڈائیلاگ تو نہیں بول رہیں؟''

''نہیں!'' مرجینا نے مضبوط لہجے میں جواب دیا، ''میں نے تمھیں صرف وہ بتایا ہے جو میں اتنی دیر سے سوچ رہی تھی!'' القرقاوی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں خاموشی سے کھانا زہر مار کرتے رہے۔ چاند اچانک برف کا بنا ہوا لگ رہا تھا اور سمندر ساکت ہو گیا تھا۔

○

# ۳۶

# ہوا کا گھوڑا

عجب سواری ہے یہ بھی — اس پر چڑھیے تو آپ سچ مچ میں ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اسے ہوور کرافٹ کہتے ہیں۔ اور اس میں ہوا کے گھوڑے جُتے ہوتے ہیں۔ کہنے کو پانی کا جہاز مگر یہ پانی پر نہیں ہوا کے سینے پر حرکت کرتا ہے مگر یہ ہوائی جہاز بھی نہیں کیوں کہ اس کے حرکت کرنے کو اُڑنا نہیں کہہ سکتے، نہ تیرنا — اصل میں یہ جہاز ہوا کے گدے کی مدد سے سمندر کی چھاتی پر پھسلتا جاتا ہے جیسے کوئی کسی برف زار میں اسکیٹنگ یا اسکی انگ کرتا ہو —

ابوعبید نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی سواری میں مجھے ضرور مزہ آئے گا کیوں کہ یہ نئے قسم کی کشتی رانی ہے۔ ہوا کا گھوڑا ہونے کے باوجود اس میں بادبانوں کا کوئی کام نہیں جن کے ذریعے جہازراں پہلے ہوائے تازہ کو شکار کرتے تھے۔ بادبانوں کی جگہ اس جہاز پر چار پانچ جناتی پنکھے نصب ہوتے ہیں جو جہاز کے پیندے کے ساتھ لگے ربڑ کے تھیلوں میں ایسی پھونک بھرتے ہیں کہ جہاز ایک مستانہ انگڑائی لے کے آگے چل پڑتا ہے۔

کاش سندباد جہازی یہاں موجود ہوتا تو دیکھتا کہ یہ کیا شے ہے، نجانے وہ اسے صنفِ نازک کی کون سی قسم قرار دیتا مگر وہ اب کہاں — ابوعبید نے بتایا تھا کہ ایک اندھیری

رات میں جب شمال سے گرم ریتیلی ہوا کے جھکڑ اسپتال کے دریچے کے باہر کھجور کے درختوں کو بھنبھوڑ رہے تھے، یکا یک وہ نیند سے بیدار ہو کے زور سے چیخا، ''سارے بادبان گرا دو!'' اور مر گیا۔ اچھا آدمی تھا سندباد بھی۔ موت سفر کے دوران اس کے ساتھ ساتھ رہتی مگر اس نے اسے اس وقت گلے لگایا جب اس کے پاؤں پانی سے نکل کے خشکی پر ٹکے۔

جب میں دبئی سے چلا تو میری حالت بھی وہی تھی جو کسی عیاش کی ہوتی ہے جو اچانک خوفِ خدا سے ترکِ دنیا کر کے عابدِ شب زندہ دار بن جائے۔ میں نے بھی اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے اور واپسی کے سفر پر نکل کھڑا ہوا۔

اس شہر کو میں نے اپنی آنکھوں کے سامنے انگڑائی لے کر صحرائی خواب سے جاگتے اور روشنیوں، خوش بوؤں اور دل نشین منظروں سے آراستہ و پیراستہ ایک حسینۂ دل نواز کا روپ دھارتے دیکھا تھا — اور اب میں اسے چھوڑ کے جا رہا تھا۔ سمندر کے نیلے حاشیوں کے طول و عرض میں بچھی شیشے کی سڑکیں، جگمگاتے مینار و محراب اور فلک بوس عمارتیں آنے والوں کو ہمیشہ کے لیے اس جادونگری میں قید کر لیتی تھیں۔

جب میں روانہ ہوا تو وہاں ایک کہرام بپا تھا۔ ہر طرف مسافروں کا ہجوم تھا ان میں بہت سے نہ چاہتے ہوئے بھی جانے پر مجبور تھے۔ ان کی رخصتی کا پروانہ آ گیا تھا۔ حکومت کی جانب سے عام معافی کے اعلان کے بعد تمام غیر قانونی تارکینِ وطن کو دو ہفتے کے اندر اندر روانہ ہونے کی مہلت دی گئی تھی۔ سفارت خانوں پر روانگی کے کاغذات وصول کرنے والوں کا رش تھا۔ ہوائی کمپنیاں پریشان تھیں۔ جہاز کم پڑ گئے تھے مگر میرے دوستوں نے مجھے کسی مشکل میں پڑنے نہ دیا۔ سب کچھ آسانی سے ہو گیا۔ سب کاغذات تیار ہو گئے اور ابوعبید کی مہربانی سے مجھے اس ہوور کرافٹ پر جس کا نام 'امان' تھا، مناسب جگہ مل گئی تھی۔

روانگی سے ایک روز پہلے میں اپنے سارے دوستوں اور جاننے والوں اور ساتھ کام کرنے والوں سے الوداعی ملاقات کر آیا تھا۔ ابوعبید نے مجھے گلے لگا کے ایسے آنسو بہائے جیسے لوگ اپنے دور جانے والے بیٹوں کو رخصت کرتے ہیں۔ نائر جہاز میں سوار ہونے تک ساتھ رہا اور پھر آنسو پونچھتا واپس چلا گیا۔ دلبر پاکستانی نے آتے ہی جیب سے ایک لفافہ



نکال کے مجھے دیا اور کہا، ''اس میں بینک ڈرافٹ ہے جو میں ہر مہینے بھیجتا ہوں۔ اسے تم ساتھ لے جاؤ۔''

''ضرور یہ تمھارے گھر والوں کے لیے ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں تو —'' دلبر نے کہا، ''میں پہلے انھیں بڑی پابندی سے خرچہ پانی بھیجتا تھا مگر وہاں وہی ماجرا گزرا جو ابوظہبی کے ایک حساس شاعر یعقوب تصور نے اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے کہ:

صحراؤں میں عمر ہماری خاک ہوئی
گھر والوں نے تاج محل تعمیر کیے

میں بیگم کو ڈرافٹ بھیجتا رہا اور وہ پابندی سے زیور بناتی رہیں اور لڑکے نے پڑھنا لکھنا چھوڑ کے 'تنظیم وحشیانِ کراچی' میں اعلیٰ عہدہ حاصل کر لیا اور مالی معاملات میں خود کفیل ہو گیا۔ اب وہ بڑی کامیابی سے گھر کا خرچ چلا رہا ہے۔ انھیں میری مالی امداد کی قطعی ضرورت نہیں۔''

''پھر یہ بینک ڈرافٹ؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ ایدھی ٹرسٹ کے لیے۔ میں انھیں ہر مہینے پابندی سے مالی عطیہ بھیجتا ہوں کیوں کہ وہی بے چارے ایسے ہیں جو گولیوں کا نشانہ بننے والوں کی لاشوں کو سڑکوں پر سڑنے نہیں دیتے، ان کے مردہ خانے غریب عوام کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔'' پھر اس نے گلے ملتے ہوئے مجھ سے وعدہ لیا کہ میں ہر ہفتے اسے تازہ ترین اخباری تراشے روانہ کروں گا، بری خبروں کے میوزیم کے لیے۔

''اور تم کب لوٹو گے؟'' میں نے اس سے سوال کیا۔

''جب تم کسی اچھی خبر کا تراشا مجھے بھیجو گے!'' وہ ہنس کے بولا اور ہاتھ ملا کے پسنجر لاؤنج سے باہر چلا گیا۔

لتا ڈیسائی سب سے بعد میں مجھ سے ملنے آئی۔ اس نے کہا، ''تم یاد رہو گے، تمھارے ساتھ اچھا وقت گزرا، ان لمحوں کو محفوظ رکھنا۔'' چلتے وقت اس نے اپنے بیگ میں سے ایک چھوٹا سا شیشے کا مرتبان باہر نکالا جس پر ایک سیاہ رومال بندھا ہوا تھا۔

"اپنے دوست کیلاش کو بھی ساتھ لے جاؤ۔ اس میں اس کی راکھ ہے، اسے بلندی سے سندھو دریا کے سپرد کردینا کہ یہی اس کی وصیت تھی۔" میں نے دیکھا یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھیں دھندلا گئی تھیں۔

مرجینا کا خط مجھے ابوعبید نے چلتے وقت دیا تھا۔ اس نے لکھا تھا، "مجھے پتا ہے تم مجھ سے ملنے آئے تھے مگر میں الف لیلہ تھیٹر میں اس وقت موجود نہیں تھی۔ تم سے آخری ملاقات نہ ہونے کا افسوس رہے گا— تم شاید سوچ رہے ہوگے کہ میں القرقاوی کے ساتھ اپنی شادی کے انتظامات میں مصروف ہوں مگر ایسا نہیں ہے، ناصر! ہماری شادی نہیں ہو رہی ہے اور وجہ صرف یہ ہے کہ میں 'چالیس چوروں' سے دو دو ہاتھ کرنے اپنی دنیا میں واپس جا رہی ہوں۔ پچھلے دنوں غزہ میں اسرائیلی ہوائی حملے کے بعد صورتِ حال بہت بگڑ گئی ہے۔ لہٰذا میں مصطفیٰ غوباش کے ہمراہ فلسطینیوں کے اس وفد میں شامل ہوگئی ہوں جو زخمیوں، محصور عورتوں اور بچوں کے لیے طبّی اور غذائی امداد لے کر 'انتفاضہ' نامی بحری جہاز سے وہاں جا رہا ہے۔ مجھے پتا چلا کہ تمھاری جلاوطنی کا زمانہ بھی ختم ہونے کو آیا اور تم اپنی بیٹی کے پاس جا رہے ہو جو کب سے وہاں تمھاری منتظر ہے— ہوسکتا ہے تمھارے دشمن اب بھی تمھارے لیے گھات لگائے بیٹھے ہوں مگر ان سے ڈرنا نہیں، ان سے لڑتے رہنا! فی امان اللہ—

تمھاری دوست

مرجینا

میں اب 'امان' کی امان میں تھا جو بڑی روانی سے سمندر کی نیلی چادر پر پھسلتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ ابوعبید نے کہا تھا کہ جہاز چار دن میں آبنائے ہرمز کو پار کرکے مکران کے ساحل کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کراچی پہنچ جائے گا۔

جہاز کے ڈائننگ روم میں دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کیبن میں لیٹ گیا۔ اچانک دروازے پر موٹر سائیکل گرجی۔ میں اٹھنے ہی والا تھا کہ موٹر سائیکل سوار اندر آگیا۔ اس نے ہیلمٹ اتارا۔ وہ عمران تھا۔ اونچی پیشانی، روشن آنکھیں، مضبوط ہاتھ پاؤں!

"ارے تم؟" میں نے حیران ہو کے پوچھا— "یہاں؟"



"بھئی تم جو آرہے تھے، سوچا، راستے میں ہی استقبال کرلوں۔" عمران بولا۔

میں نے کہا، "تم تو ذرا نہیں بدلے، بالکل ویسے ہی ہو جیسا چھوڑ کے گیا تھا۔"

عمران ہنسا، "مگر تم اپنی بیٹی کو نہیں پہچان سکو گے، وہ اب ننھی بچی نہیں رہی۔"

اس وقت جہاز پر خطرے کا سائرن بجنے لگا۔ میں نے چونک کے دیکھا۔ دروازہ بند تھا اور موٹر سائیکل سوار جا چکا تھا۔ مگر سائرن تیزی سے بج رہا تھا۔ میں نے جلدی سے جوتے پہنے اور باہر نکلا۔ عرشے پر کپتان لوگوں کو بتا رہا تھا کہ سائرن لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لیے بجایا گیا تھا کیوں کہ ایک بحری جنگی جہاز نے جو قریبی علاقے میں موجود تھا، یہ پیغام بھیجا تھا کہ راستے میں بحری قزاقوں کی دو کشتیاں دیکھی گئی تھیں۔ کچھ دیر بعد ہی ایک بحری جہاز ان کے قریب آگیا۔ اس کا نام پی این ایس بابر تھا اور اس پر پاکستانی پرچم لہرا رہا تھا۔ جہاز کے کمانڈر نے لاؤڈ اسپیکر پر 'امان' کے کپتان کو مخاطب کیا، "قزاقوں کو بھگا دیا گیا ہے— آپ اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہیں۔"

میں اپنے کیبن میں واپس آگیا اور پھر سے سونے کی کوشش کرنے لگا مگر اب نیند کہاں تھی، میں نے اپنا بریف کیس کھولا اور اس میں سے ماروی کی تصویروں کا لفافہ اور پروفیسر عظمت علی کا ناول باہر نکالا۔ اس ناول کو میں پہلے بھی کئی بار پڑھ چکا تھا مگر بار بار پڑھنے کے بعد بھی طبیعت سیر نہ ہوتی تھی۔ خاص طور پر ان ابواب کو پڑھ کے جن میں نوری کا ذکر تھا اور سائیں راول کے چائے خانے کا۔ ماروی کی جو تصویریں عمران نے مجھے گاہے گاہے بھیجی تھیں، ان کے ذریعے میں نے اپنی بیٹی کو چھوٹی سی بچی سے جوان لڑکی بنتے دیکھا تھا مگر ان میں سب سے نئی تصویر بھی اس وقت کی تھی جب اس نے ویرا بھابی کی شاگردی میں موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلانے کی تربیت حاصل کرنا شروع کی تھی۔ اور یہ سال بھر پہلے کی بات تھی۔ مجھے پہلے تو یہ بات عجیب سی لگی تھی کہ ماروی موت کے کنویں میں موٹر سائیکل چلائے گی مگر پھر ویرا بھابی کا خط آیا، "بھئی اس میں حیرت کی کیا بات ہے— وہ میری بیٹی بھی تو ہے— ظاہر ہے مجھ پر جائے گی— اور یاد رکھو، میں اسے ایسی بہادر بنانا چاہتی ہوں کہ کوئی اس کی معصومیت کا فائدہ نہ اٹھا سکے، کوئی عام لفنگا ہو یا کوئی شہزادہ—

عمرکوٹ والا!''

اور میں نے سوچا، ٹھیک ہی تو ہے، ماروی پر عمران اور ویرا کا حق زیادہ ہے کیوں کہ انھوں نے اسے اپنے کلیجے سے لگا کے پالا ہے۔

میں نے پروفیسر عظمت علی کا ناول کھولا اور ایک بار پھر شروع سے پڑھنا شروع کیا اور پڑھتے پڑھتے سو گیا۔

O

# ۳۷

# آخری باب

ایسی سنہری صبح ناصر نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ دھوپ آسمان سے کرنوں کی سیڑھیاں لگا کے نیچے اتری اور آہستہ آہستہ پورے سمندر اور پورے ساحل پر پھیل گئی۔ ناصر کا جہاز 'امان' کراچی کی بندرگاہ کے باہر کھلے سمندر میں لنگر انداز تھا اور اسے اس وقت تک کے لیے وہیں ٹھہر کے انتظار کرنے کو کہا گیا تھا جب تک کہ اسے بندرگاہ تک پہنچانے والی بحری گزرگاہ خالی نہ ہو جائے۔

ناصر نے دیکھا ساحل سے پرے شہر کی اسکائی لائن صاف نظر آ رہی تھی — اونچی عمارتیں، مسجدوں کے مینار اور فیکٹریوں کی چمنیاں — اپنائیت اور اُنسیت کی خوش بوئیں اس کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ نیلے پانیوں میں ڈبکیاں کھاتے آبی پرندے بڑی خوش دلی سے اسے اپنی جانب بلا رہے تھے۔ ناصر کو شہر کی ساری گلیاں یاد آنے لگیں — مانوس راستے، ان پر تیز تیز قدم اٹھاتے لوگ، گھروں کے دروازوں پر پھیلتی کاسنی اور نارنجی پھولوں سے لدی بوگن ویلیا کی بیلیں، گل مہر کے پیڑ اور اونچے اونچے پام کے درخت — دن ایسے ہی منظروں کے تصور میں گزر گیا۔ جہاز کو چار بجے شام بندرگاہ میں داخل ہونے کی اجازت ملی اور جہاز کی سیڑھیوں سے ساحل پر اترنے تک مزید وقت گزر گیا۔

پھر جب وہ مسافروں کے لاؤنج میں مانوس چہروں کو ڈھونڈ رہا تھا، اچانک کسی نے پیچھے سے آ کے اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا۔ ناصر نے پلٹ کے دیکھا۔ وہ عمران تھا۔ ناصر لمحے بھر کے لیے سکتے میں رہ گیا۔ عمران کے بارے میں اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ وہ بوڑھا بھی ہوسکتا ہے مگر اس وقت جو شخص اس کے سامنے کھڑا تھا، وہ کم زور اور ضعیف لگ رہا تھا۔ اس کے بازو پتلے اور چہرے پر جھریاں تھیں اور سر کے بال غائب ہو چکے تھے۔ ناصر کے دل میں اچانک بڑے زور سے رنج اور افسوس کے بادل گرجے۔

"یہ کیا؟" اس کے منہ سے بھرائی ہوئی آواز نکلی۔

"کچھ نہیں یار—" عمران نے کہا، "موسم اپنے طریقے سے انسانوں سے خراج وصول کرتے ہیں۔"

عمران کی گاڑی پارکنگ میں تھی۔ سامان رکھا گیا، دونوں سوار ہوئے اور ڈرائیور نے گاڑی آگے بڑھائی۔ ناصر نے دیکھا ایک لینڈ اوور اُن کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی جس پر دو بندوق بردار سوار تھے۔ "یہ کون لوگ ہیں؟" ناصر حیران ہوا۔

"ہمارے گارڈ—" عمران نے جواب دیا، "آج کل ان کا کام زوروں پر ہے۔"

ناصر کو راستے میں بہت سی اور گاڑیوں میں بھی بندوق بردار محافظ نظر آئے، "کمال ہے،" وہ بولا، "پہلے تو صرف بینکوں کے سامنے ایک دو کاہل قسم کے سنتری دن بھر مکھیاں مارتے نظر آتے تھے اور ان کی زنگ آلود بندوقوں پر عموماً کباڑیوں کی نظر رہتی تھی— مگر اب—"

عمران نے ہنس کے کہا، "تم تو زمانۂ قبل مسیح کی باتیں کر رہے ہو، اب ہم نے بہت ترقی کر لی ہے۔" مسجد، گرجا گھر، امام بارگاہ، بینک، بازار ہر جگہ مسلح افراد حفاظت پر مامور ہیں، پھر بھی قاتل کبھی ناکام نہیں لوٹتے۔"

ذرا دیر میں ناصر اور عمران سرکس کے میدان تک پہنچ گئے جہاں، موت کا کنواں، بدستور موجود تھا۔ ناصر سرکس کی بستی کو پہچان گیا۔ وہاں کچھ نہیں بدلا تھا، چہل پہل بھی پرانی والی تھی۔ عمران اپنے رہائشی خیمے کا پردہ اٹھا کے اندر داخل ہوا۔ پیچھے پیچھے ناصر بھی تھا۔ اچانک ویرا بھابی نے آگے بڑھ کے ناصر کو گلے لگایا— "گھر آیا میرا پردیسی...!" وہ ہنس



کے بولیں، "شکر ہے تم کچھ زیادہ نہیں بدلے— وہی چہرہ، وہی تیور، وہی متجسس آنکھیں— ہاں بالوں میں وقت کی مکڑی نے سفید جالے ضرور بُن دیے ہیں۔"

ویرا بھابی پہلے سے موٹی ہوگئی تھیں اور رنگ بھی سنولا گیا تھا مگر چہرے کی بشاشت اور لہجے کی گرم جوشی برقرار تھی۔ اچانک خیمے کے برابر میں 'موت کے کنویں' میں سے موٹر سائیکل کے گرجنے کی آوازیں آنے لگیں اور اس کی دیواریں یوں لرزنے لگیں جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔ یہ شام کا پہلا شو تھا۔ "یہاں تو کچھ بھی نہیں بدلا،" ناصر بولا، "'موت کا کنواں' بالکل ویسا ہی ہے، جیسا چھوڑ کے گیا تھا۔"

"ہاں، 'موت کا کنواں' ویسا ہی ہے۔" ویرا بھابی نے کہا۔

ناصر کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا، "آپ اب بھی شو کرتی ہیں؟"

"موٹر سائیکلوں کے شہسوار پہلے والے نہیں رہے— میں تو کبھی کبھی یہ بدپرہیزی کر جاتی ہوں مگر عمران نے بہت دن ہوئے ریٹائرمنٹ لے لی— ویسے بھی بچے بڑے ہو جائیں تو وہ بڑوں کی ذمے داریاں خود سنبھال لیتے ہیں۔"

ناصر سمجھ گیا۔ 'موت کے کنویں' میں اب اس کی بیٹی ماروی اپنے کمالات دکھا رہی ہوگی۔ آخر وہ شاگرد کس کی تھی۔ ناصر ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔

ڈرائیور اندر آیا اور ویرا بھابی سے پوچھا، "صاحب کا سامان یہاں رکھوں یا گھر پہنچا دوں؟"

ویرا بھابی نے کہا، "اسے گھر لے جاؤ، شو کے بعد ہم لوگ بھی وہیں آ جائیں گے۔ پھر وہ مڑیں اور بولیں، "ہاں خانساماں سے کہنا کھانا تیار رکھے۔"

ڈرائیور باہر نکلا تو ویرا بھابی نے کہا، "سامنے ہی ہمارا گھر ہے، اب ہم لوگ صرف شو کے لیے یہاں آتے ہیں۔" 'موت کے کنویں' سے موٹر سائیکل کے غرانے کی آواز بدستور آ رہی تھی اور چوبی دیواریں لرز رہی تھیں۔ "شو ختم ہو جائے تو سب لوگ ساتھ یہاں سے چلیں گے۔" ویرا بھابی نے کہا۔ پھر عمران بازو پھیلا کے اپنی جگہ سے اٹھا اور ناصر کو بانہوں میں سمیٹ کے بولا، "ابھی تو مجھے یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ تم لوٹ آئے ہو— کتنی بہت سی یادوں نے تمھارے ساتھ یہاں آ کے ہمارے گھر کو بھر دیا ہے۔"

"ماروی بھی بس آتی ہوگی۔" ویرا بھابی پھر بولیں۔ اتنے میں موٹر سائیکل کی غراہٹ بند ہوگئی اور 'موت کے کنویں' میں تماش بینوں کا شور بھی تھم گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی، پھر باہر سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ناصر کا دل زور سے دھڑکا۔ اچانک خیمے کا پردہ اٹھا۔ ناصر نے سوچا، ماروی— مگر اس کی جگہ ایک خوب رُو نوجوان تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس نے موٹر سائیکل کی سواری کا لباس پہن رکھا تھا۔ ہیلمٹ، سرخ جرسی، تنگ موری کی جینز اور لمبے بوٹ—

"شو ختم ہوگیا بیٹا؟" اچانک عمران بولا، "آؤ انکل ناصر سے ملو۔"

ناصر ششدر رہ گیا— اس نے کھڑے ہو کے لڑکے کو گلے سے لگایا۔

عمران نے کہا، "بھئی یہ ہمارا بیٹا ہے اسد— اس نے میری جگہ لی ہے، 'موت کے کنویں' میں—"

"ارے—" ناصر خفگی سے بولا، "تم نے کبھی بتایا ہی نہیں اس کے بارے میں— تمھارے ہر خط میں بس ماروی کا ذکر ہوتا تھا— اسد کے بارے میں تو مجھے کچھ پتا ہی نہیں تھا۔ بڑی زیادتی کی تم نے۔"

اسد ہنسا، بولا، "انکل بابا کا خیال تھا کہ ایک بڑا سرپرائز بھی ہونا چاہیے آپ کے لیے۔"

"ایک سرپرائز—" ویرا بھابی آگے بڑھیں، "تمھارے لیے تو دو قسم کے سرپرائز موجود ہیں یہاں۔" اسی وقت خیمے کا پردہ ایک بار پھر اٹھا اور ایک دراز قد، خوش شکل لڑکی اجرک کی چادر لپیٹے اندر داخل ہوئی۔

"اور یہ ہے ہماری ماروی۔" ویرا بھابی نے کہا۔

ناصر بوکھلا کے اپنی جگہ سے اٹھا، اسے لگا جیسے ماروی نہیں، نوری سامنے آ گئی ہے۔ اس نے ماروی کو گلے لگایا اور رونے لگا۔ ماروی بھی ناصر سے لپٹ گئی۔ ویرا بھابی نے دونوں کو الگ کیا اور ہنس کے بولیں، "بیٹی کو اپنا کھویا ہوا باپ مل گیا ہے، یہ رونے کا نہیں، خوش ہونے کا مقام ہے، چلو رونا دھونا بند کرو اور بتاؤ، آج تمھاری رات کی ڈیوٹی تو اسپتال میں نہیں؟"



"آج میں نے چھٹی لے رکھی ہے آنٹی۔" ماروی نے کہا، "آج میں اپنے بابا سے جی بھر کے باتیں کروں گی، اپنی اماں کی اور ان سارے لوگوں کی جنھیں میں نے کبھی نہیں دیکھا مگر جو آج بھی میرے دل میں رہتے ہیں۔"

ناصر نے بیٹی کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا اور کہا، "میں خود تم سے ڈھیر ساری باتیں کرنے کو مرا جا رہا ہوں مگر یہ تو بتاؤ تم اسپتال میں کیا کرتی ہو، میں تو سمجھا تھا کہ تم بھی موٹر سائیکل۔"

ویرا بھابی پھر زور سے ہنسیں— "بابا یہی تو اصل سرپرائز ہے تمھارے لیے— ارے بھئی ہماری بیٹی ماروی تو ڈاکٹر ہے، دماغی امراض کی— اسے ہم نے 'موت کے کنویں' سے دور ہی رکھا ہے— عمران نے تمھیں یوں ہی چکر دینے کو لکھ دیا تھا کہ میں اسے موٹر سائیکل چلانے کی تربیت دے رہی ہوں۔ 'موت کے کنویں' کو فتح کرنے کے لیے تو میرا اسد ہی کافی ہے۔"

اسد مسکرایا، "انکل میں 'موت کے کنویں' میں موٹر سائیکل چلاتا ہوں مگر ماروی تو اپنے مریضوں کو ایسے کنووں کی سیر کراتی ہے جہاں انھیں آبِ حیات ملتا ہے۔"

ناصر کے ٹھہرنے کا انتظام عمران کے کمرے میں کیا گیا تھا۔ کھانے کے بعد وہ دونوں دیر تک پرانے دنوں اور پرانے دوستوں کی یاد تازہ کرتے رہے۔ پروفیسر عظمت علی کے ذکر سے وہ کچھ دیر کے لیے اداس ہوگئے۔ تھوڑی دیر کے بعد ناصر نے کہا، "مجھے کل بادشاہ خان کی تلاش میں جانا ہے۔ یہ بتاؤ وہ کہاں ہے آج کل اور اس کی گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی ابھی تک چل رہی ہے کہ نہیں؟"

عمران نے کہا، "جیسا میں نے تمھیں لکھا تھا، بادشاہ خان نے افغانستان کی جنگ کے دنوں میں کاروبار کا رُخ کابل کی طرف پھیر دیا تھا، لہٰذا اسے بار بار قندھار اور کابل جانا پڑتا تھا، اب کچھ دنوں سے اس نے نیٹو کی فوجوں کے لیے تیل کے ٹینکر ٹھیکے پر دے رکھے ہیں، بہت دنوں سے وہ پشاور ہی میں مقیم تھا مگر اب پتا نہیں کہاں ہے، معلوم کرنا پڑے گا۔"

اچانک ماروی اندر داخل ہوئی۔ اس نے سفید گاؤن پہن رکھا تھا اور گلے میں

اسٹیتھواسکوپ لٹک رہا تھا۔ بولی، ''بابا اچانک مجھے اسپتال میں بلایا گیا ہے، کوئی ایمرجنسی ہوگئی ہے— ایک دو گھنٹے میں آجاؤں گی، فکر مت کیجیے گا۔''

ناصر، ماروی کے جانے کے بعد بستر پر لیٹا تو سارے خواب جو اب تک اس کی آنکھوں کے باہر کب سے ہاتھ باندھے کھڑے تھے، بے دھڑک اندر گھس آئے اور وہ ابوعبید کی کشتیوں کے کارخانے، کھاڑی کے سمندر اور الف لیلہ تھیٹر سے لے کر فریدون خستہ تن کے خشک میوہ جات کے گودام اور بری خبروں کے عجائب گھر، ہر جگہ کی سیر کرتا پھرا۔

صبح دس بجے تک جب ناصر بادشاہ خان سے ملنے کے لیے گھر سے تیار ہو کے نکلا، ماروی اسپتال سے واپس نہیں آئی تھی۔ وہ پریشان تھا مگر عمران اور ویرا بھابی نے اسے تسلی دی کہ آج کل کے حالات میں ماروی کو اکثر مریضوں کی دیکھ بھال کے لیے دیر تک اسپتال میں رکنا پڑتا تھا اور یہ کوئی اَن ہونی بات نہیں تھی۔

اسد نے بھی ناصر کو اطمینان دلایا، ''ماروی کو اپنے مریض بہت عزیز ہیں انکل— اس کی فکر نہ کیجیے، جیسے ہی اس کا کام ختم ہوگا، وہ واپس آجائے گی۔''

ناصر عمران کے ڈرائیور کے ساتھ بادشاہ خان کی تلاش میں نکلا۔ پہلے وہ وزیر مینشن کے پاس اس کے پرانے دفتر پر گیا مگر وہ عمارت بڑی خستہ حال ہو چکی تھی اور پھاٹک پر تالا لگا ہوا تھا۔ ایک چوکی دار نے بتایا کہ بادشاہ خان گڈز ٹرانسپورٹ کمپنی کا دفتر ویسٹ وہارف منتقل ہو چکا ہے۔ کچھ دیر کی تگ و دو کے بعد آخر کار ناصر نے وہ دفتر ڈھونڈ نکالا مگر وہاں صرف اس کے کچھ کارندے اپنے کاموں میں مصروف نظر آئے۔ ان ہی سے پتا چلا کہ بادشاہ خان کل ہی پشاور سے واپس آیا ہے اور اپنی ڈیفنس سوسائٹی کی کوٹھی میں مقیم ہے۔ کوٹھی پر بڑا سخت پہرہ تھا۔ کئی بندوق بردار محافظوں اور کئی پیغام رسانوں کی مشترکہ کوششوں کے بعد ناصر اپنے نام کا رقعہ اندر بھجوا سکا۔ مگر پھر کچھ دیر نہیں لگی، سب دروازے کھل گئے اور ناصر کو بڑے تپاک کے ساتھ اندر لے جایا گیا۔ یہ بہت بڑا کمرہ تھا جس میں قالینوں، صوفوں اور آئینوں کی بھرمار تھی۔ ناصر ایک صوفے پر بیٹھ گیا، پھر اچانک ایک دروازہ کھلا اور اس نے بادشاہ خان کو اندر آتے دیکھا۔ مگر نہیں یہ تو کوئی اور تھا— ناصر گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ ایک



ملازم ایک وہیل چیئر کو دھکا دیتا ہوا سامنے آیا اور وہیل چیئر پر بادشاہ خان کا بھوت براجمان تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچا جس کا نچلا دھڑ بے کار ہو چکا تھا— بادشاہ خان کو اس حال میں دیکھ کے ناصر کی چیخ نکل گئی— ''یہ کیا ہوا تمھیں بادشاہ خان؟''

بادشاہ خان کے بوڑھے اور مرجھائے ہوئے ہونٹوں پر برسوں پرانی مہربان مسکراہٹ ابھری— اس نے اپنا استخوانی ہاتھ اٹھا کے ناصر کی کمر کے گرد لپیٹا اور خوش ہو کے بولا، ''ارے یہ تم ہو، دوست، اپنے آپ کو سنبھالو، کیا تمھیں یہ دیکھ کے خوشی نہیں ہوئی کہ ایسی جسمانی حالت کے باوجود بادشاہ خان نے کاروبار میں اب تک اپنا سکہ جما رکھا ہے— ناصر میں تجھے اپنے سامنے پا کے بے حد خوش ہوں، تجھے گھر لوٹنا مبارک ہو— اپنی بیٹی سے ملے— اللہ اسے لمبی حیاتی دے، تم دونوں نے کتنے دکھ اٹھائے ہیں— اب کسی کو اپنی خوشیاں چھیننے نہ دینا۔''

''وہ تو ٹھیک ہے—'' ناصر نے کہا، ''مگر تمھارے ساتھ آخر ہوا کیا، پہاڑوں کی جنگ میں یہ حادثہ پیش آیا، یا—''

بادشاہ خان مسکرایا، ''یہ جان کے تجھے تعجب ہوگا ناصر کہ مجھے جنگ نے نہیں، امن نے شکار کیا۔ دشمنوں نے نہیں اپنوں نے مارا۔ مجھے نہیں معلوم کیا ہوا، کچھ نامعلوم لوگ تھے جنھوں نے میری گاڑی پر اندھا دھند گولیاں برسائیں— اور یہ واقعہ اس ملک کے سب سے بڑے شہر کی سب سے بڑی شاہراہ پر دن دہاڑے پیش آیا۔ ان کی دانست میں میرا خاتمہ ہو گیا تھا مگر میں زندہ رہا— میری سخت جانی کی داد دو کہ اس واقعے کو بہت سال گزر گئے مگر میں اب بھی زندہ ہوں۔''

پھر وہ بہت دیر تک بادشاہ خان کے پاس بیٹھا اس کی کامیابیوں اور کاروبار میں اس کے کارناموں کے قصے سنتا رہا مگر اس کا دل نہ لگا۔ آخر وہ اٹھا اور بادشاہ خان سے دوبارہ آنے کا وعدہ کر کے اس کی کوٹھی سے نکل آیا۔

جب ناصر گھر پہنچا تو عمران نے اسے ایک لفافہ دیا جو دُبئی سے آیا تھا۔ ناصر نے اسے کھولا، دلبر پاکستانی نے اسے ایک خبر کا تراشا بھیجا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ غزہ میں

محصور فلسطینیوں کے لیے دُبئی سے غذائی اور طبّی امداد لے جانے والے ایک بحری جہاز 'انتفاضہ' کو اسرائیلی بحریہ نے اغوا کرلیا تھا اور اس کے تمام مسافروں کو گرفتار کر کے تل ابیب پہنچا دیا گیا تھا۔ تراشے کے ساتھ دلبر پاکستانی کی مختصر تحریر تھی، ''یاد رہے کہ چوں کہ یہ جہاز اسرائیلی بحریہ نے اغوا کیا ہے، صومالی قزاقوں نے نہیں، اس لیے بین الاقوامی سمندر میں موجود عالمی طاقتوں کے جنگی بیڑے اس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرسکے۔ وہ وہاں صرف صومالی قزاقوں کی سرکوبی کے لیے موجود ہیں۔''

عمران غور سے ناصر کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا، ''کوئی خاص بات؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو۔''

''چوروں نے مرجینا کو قید کرلیا ہے۔'' ناصر نے جواب دیا۔

ناصر کو محسوس ہوا جیسے وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس نے کپڑے بدلے اور بستر پر لیٹ گیا۔ پھر اس نے اپنے بریف کیس میں سے پروفیسر عظمت علی کا ناول نکالا اور اس کا وہ باب پڑھنا شروع کیا جس میں قزاقوں اور قاتلوں کا ذکر تھا۔

''جب تک دنیا میں قزاقوں اور قاتلوں کی بھرمار رہے گی، ہم بھی وہاں موجود رہیں گے۔'' ان کا ایک فقرہ تھا۔ کس لیے بھلا؟ ناصر نے سوچا اور ایک بار پھر اسے مرجینا یاد آئی، ''میں جارہی ہوں اپنی دنیا میں، چوروں سے دو دو ہاتھ کرنے۔''

مگر کتنا مشکل ہوتا ہے یہ کام؟ ناصر کو احساس ہوا۔

''رات تو تمھیں بہت مشکل پیش آئی ہوگی؟'' ویرا بھابی ماروی سے پوچھ رہی تھیں جو ابھی ابھی اسپتال سے واپس لوٹی تھی۔

''میں بہت پریشان رہا۔'' ناصر نے کہا۔ ماروی نے باپ کے گلے میں باہیں ڈالیں اور مسکرا کے بولی، ''آپ اتنے دن باہر رہ کے آئے ہیں نا اس لیے آپ کو عادت نہیں ہے، یہاں تو اب لوگوں نے پریشان ہونا چھوڑ دیا ہے۔''

''مگر بڑی خطرناک صورتِ حال ہے یہ تو— ہر وقت جان کے لالے پڑے رہتے ہیں۔'' ناصر بولا۔



ویرا بھابی نے کہا، ''اسے تو عالمی ادارۂ صحت کی طرف سے عمان میں ملازمت کی پیش کش کی گئی تھی مگر یہ جانے پر تیار ہی نہیں ہوئی۔''

اسد نے کہا، ''بڑی مہربانی کی محترمہ نے، ورنہ—''

ویرا بھابی مسکرائیں اور عمران نے ناصر سے کہا، ''اس کے جانے کے بعد موصوف خود یہاں نہیں ٹھہرتے اور اپنی پھٹ پھٹی اٹھا کے دنیا کو تسخیر کرنے نکل کھڑے ہوتے— یہ 'موت کے کنویں' کا معاملہ تو بس ایک بہانہ ہے انھیں یہاں روکے رہنے کا، ورنہ—''

ویرا بھابی نے پھر اپنا خبرنامہ شروع کیا، ''ماروی کو تو کینیڈا میں بھی نوکری ملی تھی اور اسد میاں وہاں بھی جانے کو تیار تھے۔ کہتے تھے یہ موٹر سائیکل کس کام آئے گی اور کچھ نہ سہی تو گھر گھر پیزا پہنچانے کا کام تو مل ہی جائے گا۔''

ناصر خوب ہنسا، ''یہ تو بڑا اچھا ہوا کہ تم دونوں نے ماروی کو یہاں سے کہیں جانے نہیں دیا، ورنہ ہمارے بیٹے اسد کو پیزا ہٹ میں نوکری ڈھونڈنی پڑتی۔''

اسد نے کہا، ''انکل میں تو تیار تھا مگر یہ جو ماروی ہے نا، وہ بس یہیں رہنا چاہتی ہے۔''

ویرا بھابی نے کہا، ''ٹھیک تو ہے، وہ دور کیوں جائے، وہ بس اپنوں میں رہنا چاہتی ہے۔''

''ہاں اسی لیے تو میں بھی یہاں ٹھہرا ہوا ہوں—'' اسد پھر چہکا، ''مجھے پتا ہے میری وجہ سے ماروی یہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔''

ماروی نے اسے مصنوعی غصے سے گھورا، ''ہاں اس لیے کہ تمھارا دماغ علاج بھی بڑا ضروری ہے۔'' ویرا بھابی اور ناصر ہنس پڑے۔

''مجھے بڑی خوشی ہے کہ میری بیٹی بڑی فرض شناس ڈاکٹر ہے۔'' ناصر نے پیار سے کہا۔

''فرض شناس—'' اسد نے پھر ماروی کو چھیڑا، ''مگر بددماغ— لیکن اس میں بھی اس کا کوئی قصور نہیں، اصل میں اسپتال میں دماغی مریضوں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی وجہ سے...'' ماروی نے اسے پھر سے گھورا، ''تم سے تو خیر میں بعد میں نمٹوں گی لیکن اس وقت چوں کہ میرے مریضوں کا ذکر آگیا ہے تو میں یہ ضرور بتانا چاہوں گی کہ یہ جو لٹیرے، قاتل اور خونی ہوتے ہیں، بڑے بیمار لوگ ہیں، ذہنی بیمار— ان کا علاج ہوسکتا

ہے— ذہنی اور فکری رفوگری سے— اسے مینٹل تھراپی کہتے ہیں اور یہ جو ذہنی تھراپی ہوتی ہے نا، یہ لوگوں کے سوچنے کا انداز بدل دیتی ہے۔"

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ ناصر نے سوچا، آخر عمرکوٹ میں بھی تو یہی ہوا تھا، ماروی نے اپنی باتوں سے کسی کی سوچ بدل دی تھی۔

اس کی بیٹی کہہ رہی تھی: "کل جو شخص نہایت زخمی حالت میں اسپتال میں لایا گیا تھا، اس نے اعتراف کیا کہ اس نے بے شمار بُرے کام کیے تھے، لوگوں کو اغوا کیا، بینک لوٹے، اسکولوں، مسجدوں اور بازاروں میں دھماکے کیے اور راہ چلتے لوگوں پر گولیاں برسائیں مگر اب وہ لمحہ لمحہ پشیمانی کی موت مر رہا ہے— کچھ پتا نہیں کہ وہ بچ سکے گا یا نہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ اس کا دماغ جو برے خیالات سے آلودہ ہو کے کام کرنا چھوڑ چکا ہے، پھر سے زندہ ہو جائے، یہی تو مشن ہے میرا۔"

ناصر نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور عمران نے کہا، "اللہ تمھارے اس مشن کو کامیاب کرے۔"

"آپ لوگوں کی سب دعائیں بھی ماروی کے لیے ہیں۔" اچانک اسد بول پڑا، "میرے مشن کا کیا ہوگا بابا، کچھ اس کے لیے بھی دعا کریں۔"

ویرا بھابی مسکرائیں، "میں جانتی ہوں تیرا مشن کیا ہے— تیرا مشن پورا ہونے کی سب سے زیادہ مجھے خوشی ہوگی۔" انھوں نے ماروی کو گلے لگا کے پیار کیا۔

ناصر نے پیار سے ماروی اور پھر اسد کی طرف دیکھا۔ پروفیسر عظمت علی کے ادھورے ناول کا آخری باب میں مکمل کروں گا، اس نے سوچا اور مسکرا دیا۔

